جمال الدین افغانی

مقالہ

اردو اکادمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

۲۱ فروری سنہ ۳۲ع

از

قاضی عبدالغفار صاحب

ملنے کا پتہ

بہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

مطبع جامعہ - دہلی

جمال الدین افغانی

مقالہ

اُردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

(۲۱، فروری سنہ ۳۲ء)

از

قاضی عبدالغفار صاحب

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

(مطبع جامعہ دہلی)

دیباچہ

یہ وہ خطبہ ہے جو قاضی عبدالغفار صاحب نے ۱۲ر فروری ۱۹۳۲ء کو اُردو اکاڈمی
کے دوسرے جلسے میں پڑھا تھا اور جس کا آخری حصہ مارچ ۱۹۳۲ء کے "جامعہ" میں
شائع ہوچکا ہے۔

سید جمال الدین افغانی ملت اسلامی کی نشاۃ ثانیہ کے سب سے پہلے علم بردار تھے
اس پستی اور مایوسی کے دور میں ایک ایسے عالم باعمل کا پیدا ہونا جس کی نظر زمانے کی
رفتار کو دیکھتی اور سمجھتی تھی جس کا دل جوش اور ولولے، عزم اور استقلال سے معمور تھا۔
جس کے زبان و قلم میں سحر حلال کا اثر تھا، جس کے دست و بازو میں جہد حیات کی
قوت تھی، اس بات کی علامت ہے کہ اسلام کے خاکستر میں ابھی زندگی کی چنگاریاں دبی
ہوئی ہیں جو ہوا پاتے ہی بھڑک اٹھیں گی اور مسلمانوں کے جہل و تعصب اور غیروں
کے ظلم و استبداد دونوں کے انبار میں آگ لگا کر چھوڑیں گی۔ جمال الدین کا پیکر خیالی
ہم افسردگان خام سے پکار پکار کر کہتا ہے۔

حلقہ گرد من زنید اے پیکران آب و گل — آتشے در سینہ دارم از نیاگان شما

غرض جمال الدین کی سیرت وہ پیام امید ہے جسے ہر مسلمان خصوصاً نوجوان مسلمان کے
کانوں تک پہنچانا ارباب خیر پر فرض ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس فرض کو قاضی

عبدالغفار صاحب نے، جو ہر طرح اس کے اہل ہیں، پورا کردیا، قاضی صاحب عرصے سے سید جمال الدین مرحوم کی سیرت کے متعلق تحقیق کر رہے ہیں اور سفر یورپ کے دوران میں بہت سا ایسا مسالہ جمع کر چکے ہیں جو ابھی تک کسی اور کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ موصوف سید مرحوم کی ایک بسوط سوانح عمری لکھنے کا قصد رکھتے ہیں جو گویا اسلامی ممالک کی تحریک آزادی کی تاریخ ہوگی۔ فی الحال اردو اکادمی کی درخواست پر آپ نے اپنے نتائج تحقیق اس مختصر خطبے میں جمع کر دئے ہیں۔

سید عابد حسین

ناظم اُردو اکادمی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جمال الدین افغانی

"نخستیں فروزندہ کوکب آسمان شرف وجلال، و اولین مربی عالم تربیت وکمال، حامل لوائے آزادی وحریت، و ہواخواہ استقلال حقوق بشریت، پیشرو آزادی طلبان مملکت عجم، وسررشتۂ تربیت یافتگان طوائف امم، العالم الربانی والبحر الصمدانی سید جمال الدین بن السید صفدر، المعروف افغانی. آزادی اشخاص مشہور ایں قرن است (قرن ۱۴ اسلامی و ۲۰ میلادی) کہ عالم تمدن را بہ انوار ساطعہ علم و فضیلت منور فرمودہ وسلسلہ ہواخواہان ترقی مقام انسانیت را بہ پیشقدمی سرافراز و مفتخر نمود۔"

آقائے ناظم الاسلام کرمانی، صاحب تاریخ بیداری ایران آج سے ۵۰ سال پہلے شیخ کے حالات ان الفاظ کے ساتھ شروع کرتا ہے، بہت مشکل ہے کہ

شیخ کا تذکرہ مختصر لکھا جائے۔ پھر اگر صرف قلم ہی کی کوشش تفصیل و اختصار کا انحصار ہو تو یہ بھی کر لیجئے۔ مگر مشکل تو یہ ہے کہ اس سوانح نگاری میں ایک مغلوب و مفتوح قوم کے اُن جذبات کو بھی دخل ہے جن کو اکابر سلف کے اذکار اور شہیدان راہ حریت و آزادی کے تذکرے قدرتاً متحرک کرتے ہیں پس قلم کو رک جانے دیجئے تو اس کو کیا کیجئے!

معلومات کے ذریعے محدود ہیں، انکی تشریح ان اوراق کے خاتمہ پر کردی گئی ہے مگر باوجود محدود ہونے کے بھی وہ اس قدر ہیں کہ اگر محض تجارتی نقطہ نظر سے شیخ کی سوانح عمری شائع کرنی مقصود نہ ہو تو اُس زندگی کے حالات میں غور و فکر کے لئے کافی میدان موجود ہے۔ یہ مختصر مضمون اُس میدان کا صرف ایک گوشہ ہے۔

۱۸۵۱ء یا ۱۸۵۲ء میں جب شیخ ماں کی گود میں آئے۔ دنیائے اسلام پر مصائب و ابتلا کا ایک شدید طوفان گذر رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ وسط ایشیا میں خیوا و بخارا کی آزادی روسی شہنشاہیت کی قربانگاہ پر آخری سانس لے چکی تھی۔ ایران میں انگریزوں اور روسیوں کا مشترکہ اثر قائم ہو چکا تھا۔ مصر میں انگریزوں کا عارضی انتظام مالکانہ حکومت کی صورت اختیار کرنے والا تھا۔ مراقش برطانیہ اور فرانس کے باہمی سمجھوتے کی بنا پر فرانس کے زیر اثر لایا جا چکا تھا۔ سلطنت عثمانیہ میں اسلامی اقتدار کا مریض جان بلب تھا اور اُس کے سرہانے۔ اسٹریا، جرمنی برطانیہ، ریاستہائے بلقان اور روس کے دشنہ در آستین اطبا رجمع

ہو چکے تھے۔ ایک غریب اور دور افتادہ افغانستان نسبتاً آزاد تھا، وہ بھی اس لئے کہ جغرافی حیثیت سے وہ متمدن ممالک کے یورپین تمدن سے دور تھا اور روس و انگلستان کی باہمی رقابت اُس کی قومی آزادی کی ضامن تھی۔

اس عہد ابتلا میں جب ہمتیں پست، دل ضعیف، حوصلے کمزور ہو رہے تھے عالم اسلامی میں، عام تاریکی کے اندر بھی کہیں کہیں روشنی کی ایک شعاع نظر افروز ہوتی رہتی تھی، جیسے دور کے بادلوں میں بجلی کی ایک جھلک مختلف ممالک میں اللہ کا کوئی نہ کوئی بندہ تباہ حال ملت اسلامی کے لئے ایک پیام امید لیکر آتا تھا اور عالم اسلام کے کسی نہ کسی گوشہ میں اپنا ایک چھوٹا سا دیا روشن کر جاتا تھا، اُس زمانے میں جب شیخ نے پہلی دفعہ سورج کی روشنی دیکھی عالم اسلامی صدیوں کی گہری نیند کے بعد بیداری کی پہلی کروٹ لے رہا تھا۔ دلوں کے آتش خانے سرد تھے مگر چنگاریوں سے خالی نہ تھے۔ قسطنطنیہ میں ابو الاحرار مدحت پاشا اور اُنکے معاصرین مصطفےٰ فاضل، رشید پاشا، ضیا پاشا، عالی پاشا، علی سعادی، فواد پاشا عمر پاشا، ایران میں امیر نظام، ملا محمد کاظم خراسانی جیسے قوم پرست، عہد انقلاب کے حریت پسند مجتہد اور اُنکے معاصرین کہ "دور استبداد صغیر" میں انھوں نے قومی تحریک پر جان و مال فدا کر دیا، سید عبد اللہ، سید محمد طباطبائی اور ایسے ہی کتنے، پھر مصر میں صف اول کے احرار، مصطفےٰ کامل، علی پاشا محمود پاشا فلکی۔ تونس میں شیخ محمد بیرم، خیر الدین پاشا۔ وسط ایشیا و ترکستان میں سمٰعیل بے

یہ سب ایک ہی منزل کے مسافر اور ایک ہی راہ کے راہرو تھے اور اسی سلسلہ کی ایک کڑی جمال الدین افغانی تھا۔ مگر شیخ کی زندگی کا امتیاز ان سب سے الگ تھا۔ اس تمام فہرست میں شیخ ہی کا ایک نام ایسا ہے جو عمل کی جغرافی حدود سے آزاد رہا اور کبھی کسی ایک ملک کا پابند نہ تھا، وہ دیارِ مصر میں تھا، وہ ایران میں تھا، وہ ہندوستان میں تھا، حجاز میں تھا۔ ترکی میں تھا، روس میں تھا، فرانس میں تھا اور اس کی ایک آواز تھی جو مراقش سے ترکستان تک اور لندن و پیرس سے سینٹ پیٹرسبرگ تک سنی گئی، عہد جدید کے داعیانِ ملت اسلامی میں مشکل کوئی نام اس قدر ہمہ گیر، اس قدر عام اور اس قدر وسیع مل سکے گا یہ امتیاز شیخ ہی کے لئے محفوظ تھا!

ولادت، مقام ولادت اور عہد طفلی، یہ سب باتیں اس موقع پر بیان کرنے کی نہیں جس شخص کا وطن تمام عالم اسلامی تھا۔ اُس کے مقام ولادت کا سوال ہی کیا جس نے مشرق کا دامن مغرب سے باندھ دیا تھا، اُس کے متعلق یہ بحث قدرے دور از کار ہے کہ وہ اسد آباد میں پیدا ہوا یا اسعد آباد میں، وہ افغانی النسل تھا، یا ایرانی، وہ شیعہ تھا یا سنی، اس کا سلسلہ نسب اس کو بقول صاحب تاریخ بیداری ایران "بہ خامس آلِ عبا حسین بن علی بن ابی طالب میرسیا" یا یہ کہ سید صفدر کے بیٹے کا نسب صحیح ترمذی ہی کے مؤلف تک ختم ہو جاتا ہے پھر یہ بحث کہ شیخ ایرانی تھے یا افغانی خود ایرانی اور افغانی ملتوں کے درمیان

مابہ النزاع ہے دونوں طرف سے اپنے اپنے دلائل پیش کئے جاتے ہیں اور شیخ کا ہر سوانح نگار اپنے دعوے کی دلیلوں کا دریا بہا دیتا ہے شیخ کی شخصیت کا یہ عجیب و غریب کرشمہ ہے کہ ایران کہتا ہے وہ ہمارے تھے اور افغانستان کہتا ہے وہ ہمارے تھے۔ ایک بزرگ افغانی کہتا ہے کہ

"در ہندوستان یک عقیدہ موجود است کہ جمال الدین مرحوم را ایرانی اسد آبادی میگویند و این صرف خیال و وہم بنظر می آید۔ تمام دلائل ایرانی بودن او در کاوہ موجود است ولے ہیچ کدام دلیل نیست۔ نویسندہ محقق کاوہ خودش این را قبول ندارد۔ ولے بیچارہ افغان با امروز در دنیا زبانے را وصدائے را مالک نیستند . . . . . امیر ارسلان شامی (کہ خود مولانا را ملاقات کردہ و ارادت شاگردانہ بہ او دارند) و عالم اجل موسیٰ جار اللہ تاتاری پیش من خود از افغانیت او شہادت دادہ اند و امیر شکیب ارسلان میفرماید کہ خود مولانا بہ افغانیت خود اعتراف داشتند . . . . من شنیدہ ام کہ در دفاتر افغانیہ کاغذات نسبت بخاندان ایشان و بنام پدر ایشان رسید صفدر موجود ہستند۔ و از خاندان ایشان بعض تا بحال در علاقہ کنر (در افغانستان کہ برائے سکونت سادات مخصوص است (شیر گڈہ نام جائے است کہ مخصوص است) اقامت دارند تستن مولانا دانستن زبان افغانی مولانا، رتبہ ہمہ وزارت مولانا، در عہد امیر محمد اعظم خاں در افغانستان چیز ہائے نیست کہ

غیر افغان بودن مولانا چیزے دیگر ثابت کند۔ نیز بزرگ ترین رفقائے مولانا مجتہد معظم مصری شیخ محمد عبدہٗ صریحاً از جائے ولادت او بنام وا ز افغان بودن مولانا ذکر می کند۔"

یہ ایک ایسے شخص کے الفاظ ہیں جو آج بہت بلند منصب پر دنیائے اسلام کا مقبول و محبوب ہے۔ کاش کہ مجھے اُس کے نام کے ظاہر کرنے کی اجازت ہوتی۔

برخلاف اس دعوے کے ایرانی مصر ہیں کہ شیخ ایرانی تھے اور وہ ان کے ایرانی ہونے پر دلیلیں لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مجتہدین ایران پر جو شخص اثر شیخ کا تھا وہ یقیناً ایرانی اور شیعہ ہونے کی حیثیت سے تھا، دونوں کی طرف کی بہت سی شہادتیں ہیں جن کو اس موقع پر نظر انداز کرتا ہوں مگر مستقل تالیف میں انشاء اللہ پیش کرسکوں گا۔ لیکن اس بحث کو دو بڑے یوروپین مستشرقین کی رائے کا حوالہ دئے بغیر ختم کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ وہ دونوں بھی یعنی براؤن اور بلنٹ اختلاف رائے رکھتے ہیں، براؤن کا خیال ہے کہ شیخ ایرانی تھے، وہ ایران کا ایسا شیدائی ہے کہ دنیا کی ہر اچھی چیز ایران کو دے دیتا ہے۔ مگر بلنٹ جس کو بہ نسبت براؤن کے شیخ سے بہت زیادہ قرب تھا، یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ شیخ افغانی تھے، بلنٹ کے ذاتی تعلقات شیخ کے ساتھ بہت گہرے تھے اور اس باب میں بلنٹ ہی کی رائے صحیح مانی

جائے تو بہتر ہے۔ وہ لیڈی این بلنٹ کے غیر مطبوعہ روزنامچہ میں اُس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے جبکہ شیخ زندہ تھے، یوں لکھتا ہے کہ

"اب بھی (۲۴ ستمبر ۱۸۸۳ء) اُن کے والد، والدہ، چچا، خالہ، اور تمام رشتہ دار کونان میں رہتے ہیں جو کابل سے جلال آباد کی سڑک پر دو دن کی مسافت پر۔ شیخ کے ایک عزیز سید محمد بادشاہ کونان کے حاکم ہیں اور ان کی شادی دوست محمد خاں کی ایک لڑکی سے ہوئی ہے۔"

اس اہم شہادت کی تصدیق مجھے افغانی سفارت کے اعلیٰ حکام سے حال ہی میں حاصل ہوئی اور میں ذاتی طور پر یہ یقین رکھتا ہوں کہ جو آفتاب انیسویں صدی کے آخر میں تمام عالم اسلامی پر چمکا وہ خاک افغانستان سے بلند ہوا تھا اور وہ دولت خدا داد ہی کا ایک انمول الماس تھا۔ وہ چشمۂ حیات جو ہندوستان و مصر و ایران، ترکی و روس، فرانس و انگلستان، خیوا و بخارا تک بہتا چلا گیا، افغانستان ہی کی پہاڑیوں سے ابلا تھا۔ اس واقعہ کی میں تصدیق کر چکا ہوں کہ کونان کے گورنر سے جو شیخ کے عزیز تھے امیر دوست محمد خاں کی لڑکی منسوب ہوئی تھی اور بظاہر ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایرانی اور شیعہ اس رشتہ کی عزت افغانستان میں حاصل کر سکتا۔ اس لئے اس مسئلہ کو میں اسی دعوے پر ختم کرتا ہوں کہ شیخ افغانی تھے اور افغانستان ہی کی خاک سے پیدا ہو کر اب سلطنت آل عثمان کی خاک میں محو خواب

ابد ہیں۔

شیخ کے ابتدائی زندگی کے حالات کو کسی دوسرے موقع کے لئے چھوڑ کر میں انکی عملی زندگی کے آغاز کا رسے اس داستان کو شروع کرتا ہوں :-

شباب کا ابتدائی زمانہ (۱۸ سال کی عمر تک بقول براؤن) اُس ملک میں گزرا جہاں سیاسی دنیا، صبح کو کچھ اور شام کو کچھ ہوتی تھی۔ افغانستان میں سیاسی انقلاب کی آندھیاں چل رہی تھیں اور تخت حکومت سے ایک دعویدار اتارا جاتا تھا تو اُس پر دوسرا بٹھایا جاتا تھا۔ اپنی جوانی کے آغاز میں شیخ نے سیاست کا پہلا تجربہ خود اپنے وطن میں حاصل کیا لیکن وہ ابھی تک ناظر تھے عامل نہ تھے۔ وہ وقت ابھی نہیں آیا تھا کہ شیخ کی طبیعت کا جوہر اعلیٰ بروئے کار آتا۔ یہ فخر اس اجڑے دیار، اس غلاموں کے ملک کا مقسوم رہا جس کو ہندوستان کہتے ہیں، سب سے پہلے شیخ کا جذبۂ عمل اسی ملک کے سیاسی حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد متحرک ہوا۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ شیخ کی سیاسی تربیت میں اُن حالات کو بہت کچھ دخل تھا جو انھوں نے اپنے پہلے سفر ہندوستان میں اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپنے کانوں سے سنے۔ ہندوستان کا یہ پہلا مطالعہ گویا محض سرراہ تھا۔ اس لئے کہ شیخ گھر سے بیت اللہ کا عزم کرکے نکلے تھے۔ لیکن علوم جدیدہ کی تکمیل کے

خیال سے تقریباً ایک سال اور کچھ ماہ ہندوستان میں فقیرانہ اور مسافرانہ مقیم رہے۔ خراب آباد ہندوستان کے لئے یہ شرف کیا کم ہو کہ اس داعی اعظم کا پہلا قدم گھر سے نکل کر اُس سرزمین پر رکھا گیا جس کی عظمت دیرینہ کچھ ہی عرصہ پہلے تمامتر تباہ ہو چکی تھی اور جس کے فرزند تخت حکومت سے محروم ہو کر غلامی کی زندگی بسر کرنا سیکھ رہے تھے۔ لال قلعہ میں دودمان تیموری کا ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ باقی رہ گیا تھا۔ شیخ نے ۱۸۵۶ء کا وہ زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھا جب ۱۸۵۷ء کا کوہ آتش فشاں آتش فشانی کے لئے تیار ہو رہا تھا لیکن اس وقت نہ شیخ کسی کو جانتے تھے نہ شیخ کو کوئی جانتا تھا، وہ مسجدوں کے حجروں میں اور مدرسوں کے بوریہ پر درس عبرت لے رہے تھے۔ کیا تعجب ہے کہ اسی پہلے سفر میں انھوں نے ایک محکوم قوم کے زخموں کو دیکھ لیا ہو اور اسی تاثر نے اُن کی آئندہ زندگی کی جد و جہد کا راستہ ان کو بتایا ہو۔

۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان ایک خوفناک انقلاب کی کشمکش میں مبتلا تھا شیخ بیت الحرام میں ملت اسلامی کے مستقبل کے لئے دعائیں مانگ رہے تھے ایک سال کے قریب وہ حجاز میں مقیم رہے لیکن اُن کی زندگی کا یہ ایک سال تاریخ کے صفحات سے بہت دور ہے اور کسی کو معلوم نہیں کہ گہوارۂ اسلام میں انھوں نے کس طرح کسب سعادت کیا۔ مگر جب وہ حجاز سے واپس ہو کر پھر افغانستان آئے تو خود اپنے وطن کو شدید ترین خانہ جنگی میں مبتلا پایا۔ امیر دوست محمد خاں

اس وقت تخت افغانستان پر قابض تھے، انھوں نے شیخ کو اپنے دربار میں ایک اعلیٰ عہدہ پر مقرر کیا اور اس طرح اسلامی سیاسیات اور بادشاہوں کے درباروں کے مدوجزر سے شیخ کی شناسائی شروع ہوئی۔ افغانستان کی تاریخ کا یہ وہ زمانہ تھا جب خانہ جنگیوں کا غیر محدود سلسلہ افغانی سلطنت کی آزادی و عظمت کو تباہ کر چکا تھا، ہر طرف طوائف الملوکی تھی اور بدنظمی۔ چھوٹے چھوٹے سردار و خوانین، چھوٹے چھوٹے علاقوں پر قابض تھے، اور شیرازہ قومی بکھر بکھرا ہوا تھا۔ کابل حکومت کا مرکز تھا مگر برائے نام۔ ہرات کے تمام علاقے پر امیر کے چچا زاد بھائی مسلط تھے۔ اور کابل کی مرکزی حکومت اپنے تحفظ کے لئے ہرات کی جداگانہ ریاست کو مٹا دینا چاہتی تھی۔ چنانچہ جب امیر دوست محمد خاں فتح ہرات کا تہیہ کرکے اپنے داماد اور چچا زاد بھائی سلطان احمد پر حملہ کرنے کابل سے نکلے تو شیخ بھی اُن کے ہمراہ تھے لیکن امیر کی عمر نے وفا نہ کی اور ۱۲۸۰ھ میں اُنکا انتقال ہو گیا۔ اب مسند شاہی پر امیر شیر علی نے جلوس کیا اور غالباً اسی سال ہرات بھی فتح ہو گیا۔ مگر شیر علی کے دل میں ابھی اپنے بھائیوں کے قلع قمع کرنے کی ہوس باقی تھی۔ اس ارادہ کی تکمیل میں امیر شیر علی کے وزیر محمد رفیق خاں کو بہت بڑا دخل تھا، وہ بار بار امیر کو اس کام پر آمادہ کرتا تھا اور شیخ دربار میں بیٹھے ہوئے ان تیاریوں کو دیکھ رہے تھے لیکن دوست محمد خاں کے بعد انکی آواز بے اثر ہو چکی تھی۔ بعض وقائع نگاروں کا بیان یہ ہے کہ شیخ امیر دوست محمد کے بعد امیر شیر علی کے بھائی محمد اعظم کی ملازمت میں چلے گئے تھے، لیکن صاحب

بیدار ئی ایران کہتا ہے کہ ممدوح اسوقت تک شیر علی کے دربار میں موجود تھے اور یہی قرین قیاس بھی ہے اس لئے کہ سب سے پہلے خود شیخ ہی نے محمد اعظم کو شیر علی کے ارادوں سے مطلع کیا تھا۔ اگر وہ اسوقت دربار میں موجود نہ ہوتے تو شیر علی کے ارادوں سے انکا واقف ہونا بہت مشکل تھا۔ محمد اعظم، محمد اسلم، محمد امین، شیر علی کے تینوں بھائی اس سازش سے بیخبر تھے، اور جب شیخ نے انکو اس منصوبے سے آگاہ کیا تو وہ فوراً اپنے اپنے علاقوں کو بھاگ گئے جہاں وہ سمجھتے تھے کہ شیر علی کا ہاتھ بہ آسانی ان تک نہ پہنچ سکے گا۔

شیر علی اور اُسکے بھائیوں کی خانہ جنگی کی تفصیلات اُس زمانہ کا مورخ بیان نہیں کرتا۔ خود امیر عبدالرحمن خاں نے اپنی سوانحعمری میں بہت اختصار کے ساتھ انکا ذکر کیا ہے لیکن اغلب یہ ہے کہ اُس خانہ جنگی کے شروع ہوتے ہی شیخ محمد اعظم کے پاس چلے گئے اور آخر تک اُنہی کے پاس رہے۔ چنانچہ کچھ تو بہ تقاضائے احسانمندی کہ شیخ نے شیر علی کے منصوبوں کی بر وقت اطلاع محمد اعظم کو دی تھی اور کچھ شیخ کی خداداد ذکاوت و ذہانت سے متاثر ہو کر محمد اعظم نے شیخ کو اپنا مشیر خاص اور معتمد بنا لیا، چنانچہ جب محمد اعظم خاں اور انکے بھتیجے عبدالرحمن نے دارالسلطنت پر قبضہ حاصل کیا اور عبدالرحمن کے والد محمد افضل خاں کو غزنی کے محبس سے آزاد کر کے تخت حکومت پر بٹھایا، تو دربار شاہی میں شیخ کا اثر بہت زیادہ ہو گیا۔ محمد اعظم خاں کو شیخ پر اس قدر اعتبار تھا کہ کوئی اہم کام انکے مشورہ کے بغیر انجام نہ پاتا تھا۔ پھر جب افضل خاں کے انتقال

کے بعد اُنکے جانشین محمد اعظم قرار پائے تو جیسا کہ ہونا چاہیئے تھا شیخ کو امیر نے اپنا وزیرِ اعظم مقرر کیا۔ یہ شیخ کی جوانی کا زمانہ تھا جب وہ سلطنت کے در و بست پر حاوی تھے، اُنکے لئے یہ منصب بجائے خود علوم سیاست و تدبر کا ایک مدرسہ تھا جہاں اُس داعیِ حق نے اپنی آئندہ زندگی کے لئے سرمایۂ علم فضیلت و فکر و نظر حاصل کیا۔ جب اعظم خان کو شیر علی سے شکست کھا کر بھاگنا پڑا تو شیخ بدستور کابل میں مقیم رہے۔ مگر وہ تین ماہ سے زیادہ وہاں نہ ٹھہر سکے، یہ زمانہ اُن کے لئے بہت نازک تھا، وہ محمد اعظم کے معتمد سمجھے جاتے تھے اور اس لئے شیر علی کی آنکھ میں کھٹکتے تھے وہ چاہتا تھا کہ اُن سے انتقام لے مگر ایسا کرنے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ سادات کا اثر کابل میں بہت زیادہ تھا اور وہ ڈرتا تھا کہ شیخ کو نقصان پہنچا کر سادات کے جذبات کو مجروح نہ کر دے۔ بالآخر شیخ نے خود ہی سفر حج کی اجازت طلب کی اور شیر علی نے اس شرط کے ساتھ اجازت دیدی کہ وہ براہ ایران حجاز کی طرف نہ جائیں، اس لئے کہ محمد اعظم ہنوز ایران میں موجود تھے اور شیر علی نہ چاہتا تھا کہ شیخ اُن سے ملیں۔ یہ حالات تھے جب ۱۸۶۹ء میں شیخ دوبارہ وارد ہندوستان ہوئے۔

لیکن ہندوستان میں اس وقت محمد اعظم کے سابق وزیر اعظم کی ذات سیاسی حیثیت رکھتی تھی اور حکومت برطانیہ نے جو ابھی ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد کچھ کچھ سنبھل رہی تھی شیخ کے قیام کو خلاف مصلحت سمجھا۔

ایک مہینہ تک شیخ بحالت نظربندی حکام سرکاری کی نگرانی میں ہندوستان میں رہے اور بالآخر برطانوی جہاز سے سویز بھیج دئے گئے اور اس طرح اتحاد اسلام کی سخت ترین مخالف حکومت ہی نے اتحاد اسلامی کے داعی اعظم کو ان وسیع میدانوں کی طرف بھیجا جہاں شیخ کو تمام عمر برطانوی سیاست کے دشمن کی حیثیت سے کام کرنا تھا۔

مصر میں اس دفعہ شیخ کا قیام صرف ۴۰ دن رہا اور اُن کا یہ مختصر زمانہ علماء اور طلبائے ازہر کی صحبتوں میں گذرا۔ اسی مختصر زمانہ میں اُن کی فضیلت کا پہلا نقش فراعین کی سرزمین پر قائم ہوا۔

براؤن، شیخ محمد عبدہٗ کے حوالہ سے کہتا ہے کہ شیخ غالباً بخارا سے مصر آئے تھے۔ لیکن اس بیان کی کوئی تصدیق نہیں ہوتی اور سلسلۂ واقعات سے جو پیش نظر ہیں یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان سے مصر گئے، اسی مختصر قیام کے زمانہ میں ازہر میں شیخ نے صرف ونحو پر چند لکچر دئے لیکن ابھی اسلامی ممالک میں سیاست کا صرف ونحو اُن کی زبان پر نہ آیا تھا ازہر ہی کا صرف ونحو اُن کے سیاسی صرف ونحو کا آغاز تھا۔ وہ اگر کچھ زیادہ مصر میں ٹھہر سکتے تو اس کا موقع آتا، لیکن ہندوستان کے ۱۸۵۷ء سے ڈری ہوئی برطانوی حکومت کو مصر میں اُن کا ٹھہرنا گوارا نہ تھا اور بالآخر مصر سے بھی ان کو روانہ ہونا پڑا۔ دوران قیام مصر میں وہ ترکی قوم پرستوں کی تحریک سے آشنا

ہو چکے تھے اور اپنے لئے سلطنت عثمانیہ کا میدان انہوں نے تجویز کرلیا تھا چنانچہ بقول صاحب بیداری ایران "پس از مسافرت حجاز و تشرف بمکہ معظمہ فسخ عزلیت و مجملاً بسوئے اسلامبول حرکت نمود" وہ اب سفر حجاز سے زیادہ اہم اور بڑا حج کرنے والے تھے جس کے لئے عثمانی قوم پرستوں نے میدان تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔

۱۸۷۰ء میں جب شیخ قسطنطنیہ پہنچے سلاطین اور خود مختار تاجداروں کی استبدادیت کا نخل بار آور ہونے لگا تھا اور جبر کی قوت نے حریت کا ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ جمہوریت کے داعی، مدحت پاشا، علی پاشا، فواد پاشا میدان عمل میں آ چکے تھے، رشید پاشا کی تحریک پر ایک "خط ہمایونی" کا اجرا ہو گیا تھا جس میں رعایا کے خاص خاص اصولی حقوق کا اعتراف بھی کر لیا گیا تھا۔ شیخ کے ٹرکی جانے سے دو سال پہلے مدحت پاشا کونسل کے صدر بنائے جا چکے تھے اور بظاہر ایک جدید دستور اساسی کا نفاذ کیا جا رہا تھا۔ عین اس زمانہ میں جبکہ یہ ابتدائی اور عارضی انقلاب، ملت عثمانی کو بیدار کر رہا تھا۔ شیخ نے پہلی دفعہ آل عثمان کی اس سرزمین پر قدم رکھا، جس کی خاک میں اُن کے جسد خاکی کو چھ سال کی ایک ہنگامہ خیز زندگی کے بعد مل جانا تھا اُن کی سیاسی زندگی کا آغاز بلاشبہ قسطنطنیہ ہی سے ہوا اور ۲۲ سال بعد وہیں ختم ہوا۔

قسطنطنیہ پہنچے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ شیخ کو عالی پاشا صدر اعظم سے ملنے کا موقع ملا اور پہلی ہی ملاقات میں بقول صاحب بیداری ایران "بقوت جاذبۂ فضیلت وبیان چناں صدر اعظم را بسوئے خود جذب نمود کہ مافوق تصور می شود"، شیخ کی اسی قوت جاذبہ نے بہت جلد عثمانی قوم کے عامۃ الناس، وزرا، اعیان، امرا، واشراف کو اپنی طرف کھینچ لیا، اور انجمن معارف کی صحبتوں میں اپنی ذکاوت و ذہانت کا ایک کبھی نہ مٹنے والا نقش ثبت کر دیا لیکن سیاسی عمل کے اس ابتدائی دور میں، شیخ کی زندگی کا زیادہ نمایاں پہلو یہ تھا کہ انہوں نے پہلی دفعہ جبہ وعمامہ کی استبدادیت کی قوت کا احساس کیا، اور اُن کی پہلی ٹکر اسی جماعت سے ہوئی جس کے ذریعہ سے اُن کو آیندہ، مصر اور ایران میں بہت کام لینا تھا۔ اونیسویں صدی کے کوتاہ نظر علما، کی قدامت پسندی کے دو ہی بڑے مندر تھے۔ ایک ایران میں اور ایک ٹرکی میں جہاں مجتہد اور شیخ الاسلام خدا کے اختیارات کے حصہ دار اور بادشاہ کی قوت کے سرچشمہ بنے ہوئے تھے۔ شیخ نے مذہب کا ایک وسیع فلسفہ بیان کرنا شروع کیا جو "حاملین شریعت حقہ" کے کانوں پر بہت گراں تھا۔ وہ اس بدعت کو اپنی حکومت کے خلاف بغاوت اور اپنی قوت کے لئے ایک خطرہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ دو چار ہی لکچروں کے بعد شیخ الاسلام کی صحبتوں میں شیخ کے فلسفہ پر تلخ و ترش تبصرہ شروع

ہونے لگا۔
اس لئے کہ شیخ الاسلام کی جماعت کو یہ دیکھنا گوارا نہ تھا، کہ شیخ کا علم و فضل اُس جماعت کے حلقہ بگوشوں کو کسی دوسری طرف کھینچ لے جائے، سلطان عبدالعزیز کا یہ آخری زمانہ تھا، خواجہ تحسین آفندی جو جامعہ قسطنطنیہ کے صدر رہے شیخ سلیمان بلخی جو باختر سے آکر قسطنطنیہ میں مقیم ہوئے تھے اور اپنے علم و فضل کی وجہ سے مرجع خلایق ہو گئے تھے اور منیف پاشا وزیر تعلیمات، ان سب اشخاص کا شیخ کی جانب رجوع ہو جانا شیخ الاسلام کی "استبدادیت اور مطلقیت" پر ایک شدید ضرب تھی آخر کار جب شیخ ایک دن مسجد فاتح سلطان محمد میں تقریر کرنے کھڑے ہوئے اور مثنوی مولانا روم کے حسب ذیل اشعار کی تفسیر فرمائی کہ۔

علم حق در علم صوفی گم شود | ایں سخن کے باور مردم شود
علم صوفی حادث و حق از قدیم | ایں چساں در فہم آید لے سلیم

تو جو آگ سلگ رہی تھی وہ بھڑک اٹھی۔ شیخ نے اپنی تقریر کا ذکر ردعلی الدہر میں کیا ہے۔ حاجی یونس وہبی نے جو اسوقت قسطنطنیہ کے مشہور علما میں سے تھے اور اُس مجلس میں موجود تھے، شیخ کی تقریر پر اعتراضات کئے اور حسن فہمی آفندی شیخ الاسلام نے اُن اعتراضات کو سلطان تک پہنچایا اور یہ سمجھایا گیا کہ شیخ کا انداز بیان شہنشاہیت اور مطلقیت کے بہت خلاف تھا اور ایسا تھا کہ جس سے عامۃ الناس کے جذبات کے بھڑکنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے بقول

اخبار وطن (قسطنطنیہ) یونس آفندی نے بعد میں شیخ کے خلاف اپنی اس سازش کا اعتراف کیا اور وہ اپنے اس فعل سے تائب بھی ہوا، مگر شیخ الاسلام نے بالآخر شیخ کو قسطنطنیہ سے نکلوا کر چھوڑا۔ صاحب بیداری ایران اُس مجلس اور شیخ کی اُس تقریر کا ذکر بہت دلچسپ الفاظ میں کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

"چوں روز موعود رسید، جمعیتے بے حساب از اعیان واشراف وعلما ووزرا وسایر طبقات در دارالفنون اجتماع یافتند۔ پس سید بالائے منبر آمدہ شروع بتکلم نمود۔ وخطابہ راچناں بہ فصاحت وبلاغت بآخر رسانید کہ مردم را مات ومبہوت بہ آں سحر بیاں نمود۔ رؤسائے اہل علم را بعضے از آرائے سید در ترویج صناعت ومعارف خوش نیامد، ومطلب رابہ شیخ الاسلام رسانیدند۔ مشارٌ الیہ رانظر بکدورت سابقہ فرصت وراہ بہانہ بدست آمدہ تبعید سید را از سلطان استدعا نمود۔ وپس از باب عالی چنیں حکم صادر گردید کہ برائے اسکات فتنہ ورفع غائلہ سید چند ماہ از اسلامبول مہاجرت اختیار کند"

اس تقریر میں جو پہلی دفعہ شیخ اور قدامت پسند علما کے درمیان باعث اختلاف ہوئی شیخ نے ایک مثال دی تھی کہ گویا نظام عالم ایک زندہ جسم ہے اور اُس کے مختلف اعضا، اُس کے پیشے اور صنعتیں ہیں، بادشاہ دماغ ہے، لوہار اور مستری ہاتھ ہیں، زمیندار جگر ہے وغیرہ وغیرہ، اور قوم کے اس جسم میں روح

یا تو پیغمبر ہے، یا فلسفہ، مگر پیغمبری خدا کی ودیعت ہے اور فلسفہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مخالفین نے شیخ کی گفتگو کے یہ معنے پیدا کئے تھے کہ گویا شیخ نبوت کی توہین کرتے ہیں اور اسکو فلسفہ کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں اور نہ سمجھنے والوں کو یہ بیان بمنزلہ کفر بتایا گیا، جیسا کہ مذہبی قدامت پسندوں کا دستور ہے اس "کفر" کی عام تشہیر کی گئی اور جہلا میں شیخ کے خلاف سخت جوش پیدا کرادیا گیا غرض کہ شیخ کی پہلی آواز دعوت نے اُن کو پہلے امتحان میں ڈالدیا اور وہ قدامت پسندوں کا ایک تلخ مگر عبرت آموز تجربہ لیکر قسطنطنیہ سے روانہ ہوئے۔ مگر اُن کو ہدایت اور تبلیغ کا آسان راستہ مل گیا اور اُنہوں نے غالبًا یہ سمجھ لیا کہ ان ہی علما کی اصلاح اور ان کے مفاسد کی بیخ کنی میں ملت اسلامی کی فلاح مضمر ہے

براؤن کہتا ہے کہ جب شیخ پہلی دفعہ شیخ الاسلام سے ملنے گئے تو اُنھوں نے دیکھا کہ مخلوق کا ایک ہجوم شیخ الاسلام کے حضور میں بحالت رکوع جمع ہے، لیکن شیخ سیدھے بڑھتے چلے گئے اور شیخ الاسلام کے پہلو میں جا بیٹھے شیخ الاسلام جمال الدین کی اس جسارت کو کبھی نہ بھول سکے اور فتویٰ کفر کا حربہ آخر کار کچھ عرصہ کے لئے کارگر ہوا۔ شیخ باوجود ان حملوں کے ہمت نہ ہارے تھے اور اُنھوں نے قسطنطنیہ سے روانہ ہونے سے پہلے عالی پاشا سے تحریک کی کہ شیخ الاسلام کے اور اُن کے درمیان ایک عام مجلس میں مناظرہ کرایا جائے مگر شیخ الاسلام کے عہدہ کا وقار ایک گمنام شیخ کا حریف نہ بنایا جاسکتا تھا اور

بالآخر شیخ حج کا ارادہ کرکے روانہ ہوگئے۔ لیکن اب وہ اپنی زندگی کی اُس منزل میں تھے جہاں زندگی کا حج اکبر اُن کو کرنا تھا۔ اُسی حج اکبر کا خیال ان کو قسطنطنیہ سے پھر ایک دفعہ مصر لایا۔ ۲۲ مارچ ۱۸۷۱ء کو وہ مصر پہونچے اور آتے ہی اپنے نصب العین کی تکمیل میں مصروف ہوگئے۔ شیخ کی زندگی کے اس دور نے اُن کی شخصیت کو ایک بین الاقوامی شخصیت بنا دیا اسی نقطہ سے انگلستان اور یورپ کے خلاف اُن کی سیاسی زندگی شروع ہوتی ہے

مصر میں اُس وقت یہ حال تھا کہ خدیو اسمٰعیل کی بداعمالیوں اور بدمستیوں نے برطانوی " دخل " کی بنیادیں مضبوط کردی تھیں۔ خدیو کی انتہائی فضول خرچیوں نے، عام رعایا اور فلاحین کو سخت قحط کی بلا میں گرفتار کردیا تھا۔ یورپ کے ساہوکار اور حصہ دار اپنے سود اور منافع کا شدید تقاضہ کر رہے تھے، سلطنت کا دیوالہ نکل چکا تھا اور اسمٰعیل اپنے عہد کے چند آخری سال بہت بدنامی اور رسوائی کے ساتھ گذار رہا تھا۔ مصر کی آزادیوں کے خاتمہ کا وقت تھا جب شیخ نے پہلی دفعہ اس سرزمین پر احیاء ملت کا علم بلند کیا۔ ہندوستان و افغانستان میں وہ انگریزی تدبر کا تجربہ حاصل کرچکے تھے اور اپنے قلب کے تاثرات کو اب بلند آہنگی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرنے کا اُنھوں نے عزم کرلیا تھا۔

مصر میں شیخ کے فضل وکمال نے بہت جلد ریاض پاشا وزیر اعظم

کو متاثر کیا اور اُن ہی کے اصرار پر شیخ نے کچھ عرصہ مصر میں قیام کا ارادہ کر کے طلبا، اور علمائے ازہر کی صحبتوں میں اپنا کام شروع کر دیا۔

تقریباً ۸ سال شیخ نے دیارِ مصر میں اس طرح گذارے کہ وہ اہلِ علم و سیاست کا مرجع ہو گئے تھے، نہ صرف علمی حلقوں میں آن کے افکارِ عالیہ ادب و احترام سے سُنے جاتے تھے، نہ صرف مذہبی صحبتوں میں اُن کے اجتہادات واجب التعظیم تصور کئے جاتے تھے، بلکہ سیاسی جماعتیں بھی اپنے مسائل کو شیخ ہی کے مصلے کی طرف لاتی تھیں، حتیٰ کہ شیخ کی شخصیت کے بڑھتے ہوئے وزن کو انگریزوں نے محسوس کیا اور وہ سمجھنے لگے کہ شیخ مصر میں انگریزی اثر کے خلاف ایک انقلابِ عظیم پیدا کرنا چاہتے تھے۔ شیخ نے قوم پرستوں کی ایک منظم سیاسی انجمن قایم کر لی تھی جس میں تقریباً تین سو اہلِ فکر و نظر شریک ہو چکے تھے، اس تنظیم میں بلا شبہ انگریز اپنے منصوبوں کی خرابی مضمر پاتے تھے۔

اس انجمن کے اثرات نے ملک میں عامۃ الناس کے خیالات اور زبان کا رنگ ہی بدل ڈالا۔ کوئی دن خالی نہ جاتا تھا کہ مصر کے بازاروں میں انگریزی "دخل" کے خلاف مضامین اور اشتہارات شائع نہ ہوتے ہوں شیخ محمد عبدہٗ، سعد زاغلول پاشا، عبداللہ نعیم بے، احسان بے اور ایسے کتنے ہی مصری وطن پرست شیخ کے حلقۂ ارادت میں سرگرمِ عمل ہو گئے، "ازہر" جو قدامت پسندی کا بہت بڑا مرکز تھا۔ شیخ کے خطبات کا ایک ایک لفظ اُن کے

احباب اور شاگرد قلبند کر لیتے تھے، "جمیعت ماسونیہ" نے جو مصر کی ایک باثر جماعت تھی۔ شیخ کو اپنا صدر بنا لیا اور ملکی اخبارات نے شیخ کی تعلیمات سے متاثر ہو کر ایک نئی آواز میں اور ایک نئے لہجہ میں آزادی کا گیت گانا شروع کیا۔ غرض کہ مصر کی قومی زندگی میں شیخ نے جس عظیم الشان انقلاب کی بنیا درکھی اس کے تین پہلو بہت نمایاں تھے۔

(۱) اول یہ کہ اونہوں نے مذہبی خیالات، عقائد، اور توہمات میں اپنے اجتہادات سے تغیر پیدا کر دیا، حتی کہ فلسفہ جدید کے بعض اجزا کو اپنی تعلیمات کا جزو بنا لیا اور سائنس جدیدہ کے انکشافات اور مسلمات کی کسوٹی پر مذہبی عقائد کو جانچنے لگے یہ "بدعت" قدامت پسندوں کی سخت مخالفت کے باوجود قلوب پر اپنے نقوش پیدا کرنے لگی۔ درحقیقت شیخ نے پھر ایک دفعہ آزاد سیاست کا ٹوٹا ہوا رشتہ مذہب کے کارفرماؤں کے ساتھ جوڑ دیا، اور مصر کی سیاست کا یہی سبق اونہوں نے ایران کو پڑھایا جہاں مجتہدین کا شدید ترین قدامت پسند طبقہ ایک عظیم الشان قومی انقلاب پیدا کرنے والا ثابت ہوا۔ یہ فیض بڑی حد تک شیخ ہی کی اُن تعلیمات کا تھا جن کا آغاز مصر سے ہوا۔ آنھوں نے علما، کی دماغی فضا بالکل بدلدی۔

(۲) شیخ نے پہلی دفعہ مصر میں قوم پرست اخبار نویس پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی اور ملکی اخبارات کی آواز میں وہ قوت پیدا کر دی جو اس سے

پہلے کسی اسلامی ملک کو میسر نہ تھی، ایران کے دور انقلاب سے پہلے اور بعد ہاں قومی اور آزاد اخبار نویسی کا جو ہنگامہ پیدا ہوا وہ یقیناً مصری اخبار نویسی کی آواز باز گشت تھی۔

(۳) شیخ کی جد و جہد کا تیسرا نمایاں پہلو یہ تھا کہ فلاحین اور غریب رعایا کے حقوق کی حفاظت، شہنشاہیت کے جبر و استبداد، اور غیر ملکی تسلط کے خلاف اُنھوں نے قومی جذبات کو اس درجہ مشتعل کر دیا کہ اُن کی ڈالی ہوئی چنگاری آج پچاس ساٹھ برس بعد بھی سلگ رہی ہے اور نہر سویز کا تمام پانی اور برطانوی دخل کی تمام قوت اُس کو ٹھنڈا نہ کر سکی ہے۔

مصری سیاست میں شیخ کی سیاست کا بڑا واقف کار اور شیخ کا رفیق تھا جس نے اپنی تصانیف میں اُن کی سوانح عمری کے لئے بہت معتبر مواد جمع کر دیا ہے۔ وہ ایک مقام پر مصر کے اُن حالات کا خاکہ پیش کرتا ہے جن حالات میں شیخ نے وہاں کی سیاسیات میں ہاتھ ڈالا۔ جیسا کہ مصری تاریخ کے ہر پڑھنے والے کو معلوم ہوگا مصر میں برطانوی مداخلت کے دو ہی اسباب تھے، اول خدیو اسمٰعیل کی فضول خرچیاں، اور دوم ہندوستان کا تحفظ۔ اسمٰعیل کی فضول خرچیوں نے اس کو یورپ کے ساہوکاروں کا غلام بنا دیا اور بالآخر نہر سویز کے حصص کو فروخت کرکے اس نے ہمیشہ کے لئے نہ صرف مصر کی آزادی کا بیعنامہ لکھدیا بلکہ ہندوستان کی غلامی کو بھی دوامی بنا دیا۔ یہ واقعات ۱۸۷۵ء اور ۱۸۸۰ء کے درمیان پیش آئے اور یہی زمانہ مصر میں شیخ

کی کوششوں کے آغاز کا تھا، یہی وہ زمانہ تھا جب ترکی کی قوت کو میدانِ جنگ میں ایک سخت ترین صدمہ پہنچا کر روس نے قسطنطنیہ کے دروازے پر ملت عثمانی کی موت کا نقارہ بجا دیا تھا۔ یہی سلسلہ واقعات تھا جو بالآخر مصر میں برطانوی سیادت پر منتہی ہوا۔ برلن میں دول یورپ کی خفیہ کانفرنس نے ان اسلامی ممالک کی تقسیم کا مسئلہ طے کر دیا تھا، قبرص پر برطانیہ کا قبضہ تسلیم کیا گیا، فرانس کو ٹیونس پر قبضہ کر لینے کی اجازت دی گئی، مصر کی مالیات پر برطانیہ اور فرانس کی مشترکہ سیادت طے کی گئی، شام میں فرانس کے حقوق کو قائم کر دیا گیا اور اس طرح رفتہ رفتہ تمام اسلامی ممالک کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا خدیو اسمٰعیل اپنے یورپین قرضخواہوں سے تنگ آ کر اہل ملک کی ہمدردیوں کا متلاشی ہوا اور مصری قوم پرستوں کو خوش کرنے کے لئے اُس نے آئینی اصلاحات کے وعدے بھی کر لئے، لیکن آئینی اصلاحات یورپین سیاسات کے لئے سم قاتل ثابت ہوئیں اس لئے دول نے یورپین ساہوکاروں کے دباؤ میں خدیو کو اس کے ارادہ سے روکا۔ بالآخر فرانس اور برطانیہ کے اثرات نے سلطان کو مجبور کر کے اسمٰعیل کو معزول کرا دیا۔ اسمٰعیل نے جو کچھ وعدے شیخ کی جماعت سے کئے تھے عارضی طور پر اسمٰعیل کی برطرفی کے بعد ان کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن شیخ کی کمان میں ابھی دوسرا تیر باقی تھا، اور وہ شاہزادہ توفیق تھا جو خفیہ طور پر شیخ کی جماعت میں شریک تھا اور شیخ کے اصولوں کا

حامی تھا۔ اس لئے جب اسمٰعیل کی برطرفی کے بعد سلطان نے توفیق کو اس منصب پر نامزد کیا تو مصری قوم پرستوں کی امیدیں پھر ہری ہو گئیں شیخ اور ان کی جماعت جو بادشاہوں کی خود مختاری کو مٹانے پر تلی ہوئی تھی اور ازہر کے خلوت خانوں میں یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اسمٰعیل کو اُس کے جرائم کی پاداش میں قتل کر دیا جائے توفیق کی مسند نشینی پر قدرتاً خوش تھی لیکن شیخ کو بادشاہوں کے وعدوں سے ابھی کئی دفعہ دھوکے کھانے تھے، وہ افغانستان میں بادشاہی درباروں کے رنگ دیکھ چکے تھے، پھر بھی توفیق سے امید کا رشتہ جوڑے ہوئے تھے۔ لیکن ان کو جلد معلوم ہو گیا کہ بادشاہوں کا التفات چلتی پھرتی چھاؤں ہے، وہی توفیق جو چند روز پہلے شیخ سے کسب سعادت کر رہا تھا ابھی دو ہی دن تخت حکومت پر بیٹھا ہوگا کہ اپنے تمام وعدوں کو بھول گیا اور برطانوی اثرات سے متاثر ہو کر شیخ کی جلاوطنی پر آمادہ ہو گیا۔ صاحب بیداری ایران لکھتا ہے کہ :-

(شیخ) "بہ تربیت نشر ہائے فرانسہ انجمنے تشکیل داد۔ اصحاب و دوستان خود را از علما، و اعیان وغیرہم در آں انجمن دعوت نمود و تقریباً سی صد نفر در آنجا عضویت یافتند۔۔۔ رفتہ رفتہ کار انجمن بالا گرفت و کونسل انگلش را بوحشت انداخت مشار الیہ بحکومت مصر رسید سعایت نمود و نیز جماعتے را برائے افساد در انجمن فرستاد، احوال

مصر روے بدبختی نہاد وانقلابے در آنجا ظہور پیوست کہ بر قوت اہتمام سید افزود۔ پس از پیشگاہ خدیوی توفیق پاشا امر بہ اخراج اُو وملازمش ابوتراب صادر نمود۔"

توفیق جو شیخ کی جماعت کا رکن تھا، ایک ہی مہینہ میں کچھ سے کچھ ہو گیا وہ دو طرف کی آگ میں پھنسا ہوا تھا، ایک طرف دول یورپ کے قنصل خانے اُس پر ہر قسم کا دباؤ ڈال کر اپنے سرمایہ داروں کے روپیہ کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے اور اس کی ایک ہی صورت تھی کہ رعایا کو آئینی حقوق نہ دیئے جائیں اور دوسری طرف توفیق کے عہد شاہزادگی کے وہ اصلاح طلب احباب تھے جو اب وعدوں کے ایفا کا مطالبہ کر رہے تھے۔ توفیق جانتا تھا کہ اس جماعت کے ساتھ وعدہ خلافی کس قدر خطرناک ہے۔ وہ شیخ کی جماعت میں رہ کر اُن کی قوت سے واقف تھا اور کچھ عجب نہیں کہ اس کو یہ بھی معلوم ہو کہ شیخ شہنشاہیت کے اس درجہ دشمن ہیں کہ جن سروں پر تاج رکھا ہو اُن کو بھی کٹوا دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ وہ ضرور جانتا ہوگا کہ بادشاہوں کی زندگی کو ختم کرا دینا شیخ کے سیاسی اصولوں کا ایک اہم جزو تھا۔ یہ راز کچھ ہی روز بعد ظاہر ہوا جب تحریک اصلاح کے اثرات مصری فوج میں نمایاں ہوئے اور فلاحین کے لیڈر احمد بے عربی نے توفیق کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا، اعرابی نے اپنی قید کے زمانہ میں جو حالات لکھے تھے ان کا ذکر بلنٹ نے اپنی

Secret History of
the Occupation of Egypt.

میں کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ اعرابی شیخ کی تعلیمات سے بہت زیادہ متاثر تھا اور اس واقعہ کی تصدیق کرتا ہے کہ خدیو اسمٰعیل کو قتل کرانے کی سازش، شیخ، اور مفتی محمد عبدہٗ کے درمیان ہوئی تھی اور تجویز یہ تھی کہ خدیو کو قصر النیل کے پل کے قریب قتل کیا جائے اور بظاہر اسباب اسمیں شک نہیں کہ اگر اسمٰعیل کو سلطان نے معزول نہ کر دیا ہوتا تو اُس کا، شیخ کی جماعت کے ہاتھ سے وہی حشر ہوتا جو بعد کو شاہ ایران کا ہوا۔ اس واقعہ کی مزید تصدیق مفتی عبدہٗ کے اُس بیان سے ہوتی ہے جو بعد کو بلنٹ نے شائع کیا۔ اُس بیان میں بقول بلنٹ مفتی عبدہٗ کہتے ہیں کہ۔

"اسمٰعیل کو معزول کرنے کا مشورہ اس زمانہ میں ہو رہا تھا اور شیخ جمال الدین نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ اسمٰعیل کو کسی دن جب ڈہ اپنی سواری میں قصر نیل کے پل پر آتے جاتے ہوں قتل کر دیا جائے اور میں اس تجویز سے بالکل متفق تھا۔ مگر یہ گفتگو ہم ہی دو کے درمیان ہو کر رہ گئی اس لئے کہ اُس وقت اس کام کا کرنے والا کوئی آدمی ہمارے پاس نہ تھا۔ اگر اُس وقت ہماری ملاقات اعرابی سے ہوتی تو ہم اُس کے ذریعہ اس کام کا ضرور انتظام کرتے اور بہتر صورت بھی یہی تھی اس لئے کہ اس صورت میں یورپ کی مداخلت کا موقع پیدا نہ ہوتا۔ مگر اہل ملک کی جہالت

اور کمزوری کے باعث اُس وقت یہ امید نہ تھی کہ ہم جمہوریہ قایم کر سکتے ۔"

اگر توفیق کے علم میں یہ چیز تھی کہ شیخ کی جماعت وعدہ فروشوں کے ساتھ کیا عمل کر سکتی ہے تو ذرا بھی تعجب نہیں کہ اُس نے با اختیار ہوتے ہی سب سے پہلے شیخ ہی کو مصر سے خارج البلد کیا۔

قصہ مختصر شیخ کے سیاسی عقائد کا یہ ایک عجیب پہلو تھا جو پہلی دفعہ مصر میں بے نقاب ہوا۔ لیکن شیخ نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں کہیں اپنے اس عقیدہ کو ظاہر نہیں کیا کہ شہنشاہیت کو فنا کرنے کے لیے بادشاہوں کا قتل بھی جایز ہے گو کہ بلنٹ اور مفتی عبدہٗ کا بیان اور خود شہنشاہیت کے خلاف شیخ کی نفرت جو اُن کے اقوال واعمال سے اکثر ظاہر ہوا کرتی ہے خیال کو ضرور اس طرف رجوع کرتی ہے کہ شاید اُن کے سیاسی عقاید کا یہ بھی ایک جزو ہو پھر شاہ ایران کے قتل میں اُن کی سازش جس کی بعض شہادتیں ملتی ہیں اس گمان کو مزید تقویت پہنچاتی ہے۔ بہرحال اس امر سے قطع نظر کرکے کہ وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے یا نہ رکھتے تھے یہ تو ماننا پڑے گا کہ شہنشاہیت کے ساتھ اُن کی دشمنی بہت شدید تھی۔

مصر میں ان کی عملی زندگی کا دوسرا پہلو جو بہت زیادہ نمایاں ہوا وہ تھا جس کی مثال ممالک اور اقوام کی تاریخ میں بہت کم ملے گی یعنی ایک غیر

ملک کے آدمی نے ایک اجنبی ملک کو شیخ کی طرح اپنا وطن۔ اور ایک غیر قوم کو
اپنی قوم بناکر اس قدر کامیاب سیاسی بیداری پیدا کر دی یہ امتیاز شیخ ہی کو
حاصل تھا کہ وہ مصری نہ تھے مگر مصر کے حقوق کے سب سے بڑے اور سب سے
زیادہ کامیاب داعی تھے، ترک نہ تھے مگر ترکوں کی قومی زندگی کے سب سے
زیادہ طاقتور کارساز تھے، وہ ایرانی نہ تھے مگر ایران میں حقوق عامہ کے
سب سے بڑے مبلغ تھے۔ وہ ایک جاہل افغان قوم کے فرد تھے مگر اپنی حریت
کا سکہ اونہوں نے مصر و ایران و ٹرکی میں جاری کیا تھا۔ تاریخ عالم میں
ایسی مثالیں کم ملتی ہیں۔

گذشتہ صفحات میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ شیخ کی زندگی کا تیسرا زبردست
عنصر اُن کا مذہبی اجتہاد تھا۔ بلنٹ لکھتا ہے کہ

"گذشتہ دو سو برس میں بہت سے واعظ ایسے گذرے ہیں جنھوں نے
ہمیشہ یہ تلقین کی کہ اسلام کے تنزل کا بڑا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں نے
شریعت کی اُس طرح پابندی اور دیرینہ روایات کا وہ احترام کرنا ترک کر دیا
جو ابتداءً اسلام میں شعار اسلامی تھا۔ علاوہ بریں ٹرکی اور مصر میں ایسے
مصلحین پیدا ہوئے جنھوں نے سیاسی اغراض کے لئے حکومت کا یورپین
نقشہ بنایا۔ مگر ان مصلحین نے جو اصلاحات کیں وہ بجبر کی گئیں، شاہی احکام
کے ذریعہ سے یا علماء کو مجبور کر کے۔ مگر کبھی کوئی ایسی کوشش نہیں کی گئی

کہ ان سیاسی اصلاحات کو قرآن و حدیث کے مطابق ثابت کیا جاتا۔ گویا اس طرح سیاسی اصلاحات ہمیشہ طبقہ اعلیٰ کی طرف سے نافذ کی گئیں اور عوام کے دلوں میں اُن کی جگہ پیدا نہ ہو سکی جمال الدین کی ذہانت و جدت یہ تھی کہ انھوں نے اسلامی ممالک کے مذہبی خیالات رکھنے والے لوگوں کی ذہنیت کی اصلاح کرنے کی کوشش کی اور اس امر کی تبلیغ و تلقین کی کہ اسلام کے حالات پر نظر ثانی کی جائے اور بجائے ماضی سے لپٹے رہنے کے جدید علوم کے ساتھ پرانی ذہنیت کے بدلنے کی تحریک کو آگے بڑھایا جائے۔ قرآن و حدیث سے اُن کی وسیع واقفیت نے یہ ثابت کیا کہ اگر صحیح معنی سمجھے جائیں اور شریعت و اصلاحات سیاسی کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت اسلام کے اندر نہایت وسیع تغیرات کی گنجائش موجود ہے اور مشکل سے کوئی اصلاح ایسی ہوگی جو شریعت کے خلاف ہو"...... مصر میں شیخ نے اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کر دیا تھا کہ اسلام انسان کی تمام ضروریات کا کفیل ہونے کے قابل ہے اور عہد جدید کی تمام ضروریات کو پورا کر سکتا ہے .... علماء کے ضمیر و تخیل کو وہ اُن زنجیروں سے آزاد کرنا چاہتے تھے جس میں کئی صدیوں سے وہ جکڑے ہوئے پڑے تھے اور ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اسلام ایک مردہ قالب نہیں ہے ...... مگر یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ مغرب میں اصلاح کی اس تحریک کا آغاز ایک ایسے شخص سے ہوا جس نے وسط ایشیا کے جمود

میں پرورش پائی تھی اور پھر کس قدر تعجب ہے کہ اس اصلاحی تحریک کا آغاز اس دور و دراز دار العلوم (ازہر) میں کیا گیا"

غرض کہ بقول بلنٹ "مصر کی اس ذہنی اور اخلاقی تاریکی کی حالت میں جمال الدین کی تعلیمات ایک عجیب روشنی لیکر ہویدا ہوئیں" اور ٹھیک اُس زمانہ میں ہویدا ہوئیں جب مصر کی آزادی کا آخری سانس لیا جا رہا تھا۔

شیخ کا سب سے بڑا جانشین، دیار مصر کا مفتی اعظم شیخ محمد عبدہٗ تھا۔ جس نے شیخ کے دائرہ تلقین و تبلیغ میں آکر بہت بلند مرتبہ حاصل کیا۔ اسی طرح مصر کا ایک مشہور اخبار نویس شیخ ابراہیم الاغانی شیخ کے شاگردان خاص میں سے ایک تھا۔ جب شیخ کو توفیق نے خارج البلد کیا تو اُن کے ساتھ اُن کے آئندہ ہونے والے جانشین مفتی محمد عبدہٗ بھی مدرسہ کی ملازمت سے برطرف کر کے نکالے گئے۔ استاد اور شاگرد اس جلاوطنی کے بعد پھر پیرس میں اپنی تحریک کے ایک نئے مرکز پر یکجا ہونے والے تھے۔

مصر کو خیرباد کہہ کر شیخ نے حجاز جانے کا ارادہ کیا لیکن پھر ایک دفعہ وہ ہندوستان آئے۔ اُنھوں نے ہندوستان میں اُس زمانہ سے بھی بدتر زمانہ پایا۔ جو پہلے دیکھ چکے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُس وقت ہندوستان کے کسی مؤرخ اور وقائع نگار کے ہاتھ میں قلم نہ تھا جو شیخ کے حالات لکھتا حالانکہ اس دفعہ شیخ کی شہرت اُن سے پہلے ہندوستان پہنچ چکی تھی۔ کیا

قیامت ہے کہ ہندوستان میں شیخ کی اقامت کے متعلق جو کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں وہ تنہا انگریزی ذرائع سے! مصر سے جو شہرت لیکر وہ ہندوستان آئے تھے اوسکے تمام کانٹے برطانوی حکومت کی آنکھ میں چبھ گئے مگر اُس کا کوئی پھول اہل ہند کی نظروں میں نہ سما سکا! یہ تھا قومی ادبار جو ہم پر مسلط ہو چکا تھا۔

اس دفعہ کم و بیش دو سال شیخ ہندوستان میں رہے لیکن انکی زندگی کا یہ سارا زمانہ ایک بند کتاب ہے۔ جس کی چند سال سے لوگ جستجو کر رہے ہیں۔ مگر پتہ نہیں پاتے۔ اور میں بھی اُن ہی تہی دستان قسمت میں سے ایک ہوں۔ شیخ کے قیام ہندوستان کے متعلق ساری پونجی جو میسر آتی ہے یہ ہے۔

(۱) بلنٹ کا روزنامچہ چند ورق۔

(۲) بلنٹ کی "انڈیا انڈر رپن" کی چند سطور۔

(۳) رسالہ معلم حیدر آباد دکن کے چند مضامین۔

(۴) اور "ردّ نیچریہ" کے ۲۴ صفحات۔

بس یہ کائنات ہے جو شیخ کی زندگی کے متعلق ہندوستان والوں کے پاس ہے اور وہ بھی زیادہ تر دوسروں کی دی ہوئی!

اس دفعہ شیخ کا زیادہ قیام حیدر آباد میں رہا اور وہیں کی صحبتوں میں لوگوں نے کچھ کچھ اُن کے علم و فضل کی جھلک دیکھی۔ آخر ۱۸۸۳ء میں

جب بلنٹ نے ہندوستان کا سفر کیا تو حیدرآباد میں اُس نے شیخ کا نام سید علی بلگرامی وغیرہ سے سنا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ سید علی مرحوم شیخ کی قابلیت کے بہت معترف تھے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتے تھے کہ

"شیخ اتنے زیادہ سوشلسٹ اور تیز مزاج تھے کہ کسی اصلاحی کام کی تکمیل نہ کر سکتے تھے۔"

سید علی بلگرامی کے علاوہ نواب رسول یار جنگ سے بھی شیخ کے بہت تعلقات تھے، بقول بلنٹ نواب رسول یار جنگ کہتے تھے کہ "شیخ کے پایہ کا کوئی عالم ہندوستان میں نہیں"۔ اُن کے علاوہ کلکتہ کے مولوی عبداللطیف سے بھی شیخ کے تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ بلنٹ نے شیخ کے معتقدین کی ایک جماعت سے ہندوستان میں ملاقات کی تھی اور اپنے روزنامچہ میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ " وہ سب نوجوان ہیں، طلبا، اور پرجوش نوجوان، مجھے اندیشہ ہے کہ یہ سب انگلستان سے دلی نفرت رکھتے ہیں ۔۔۔۔ مذہب کے متعلق ان سب کے خیالات وسیع ہیں۔ درحقیقت وہی خیالات ہیں جو جمال الدین کے ہیں۔"

بلاشبہ اُنھوں حیدرآباد میں اسی لئے قیام کیا ہوگا کہ اس زمانہ میں وہ مقام اہل علم وفضل کا بہت بڑا مرکز تھا اور یقیناً وہاں وہ اپنے کام سے غافل نہ رہے ہوں گے مگر اب کون بتائے کہ انھوں نے کیا کیا تھا۔ قرائن یہ ہیں

کہ حیدرآباد میں وہ علانیہ اپنے سیاسی خیالات کا اظہار نہ کرتے تھے اور اگر کرتے بھی تھے تو خاص خاص احباب کی صحبتوں میں۔ البتہ علمی موضوعات پر وہ مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ رسالہ معلم کی اشاعت جنوری ۱۸۸۱ء میں اُن کا ایک مضمون "تعلیم و تربیت" کے عنوان سے شائع ہوا تھا جو میرے پاس موجود ہے۔

بہرحال تقریباً دو سال اس طرح گذرے۔ جب ۱۸۸۲ء میں مصر کی قومی تحریک نے ایک خطرناک انقلابی تحریک اختیار کرلی اور اعرابی پاشا مطالبہ حقوق کے میدان میں نمودار ہوئے تو ہندوستان میں برطانوی حکومت کی نظریں شیخ پر پڑنے لگیں اس لئے کہ جو درخت مصر میں بارآور ہو رہا تھا اُسکا باغبان حیدرآباد میں مقیم تھا۔ طل الکبیر کے معرکہ میں اعرابی پاشا کو شکست ہوئی اور اسکندریہ پر برطانوی بیڑہ کی گولہ باری نے آخر برطانوی "دخل" کی بنیاد کو مضبوط کردیا۔ اس زمانہ میں جب یہ ہنگامہ ہو رہا تھا۔ شیخ کو حیدرآباد سے لاکر کلکتہ میں نظربند کردیا گیا جہاں وہ کچھ عرصہ مرزا حاجی عبدالکریم شیرازی کے مکان پر مقیم رہے اعرابی کی بغاوت کے سلسلہ میں شیخ کی نظربندی کا واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۱ ستمبر ۱۸۸۱ء میں قصر عابدین کے سامنے جو فوجی مظاہرہ ہوا تھا اُس موقعہ پر اعرابی نے فخریہ کہدیا تھا کہ میں چاہوں تو ہندوستان میں مسلمانوں سے بغاوت کرادوں۔ اعرابی کا یہی قول غالباً شیخ کی نظربندی کا باعث ہوا۔

کلکتہ میں شیخ بالکل ایک سیاسی قیدی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ جب مصر میں برطانوی "دخل" مکمل ہو چکا تو شیخ کو ہندوستان سے روانہ ہونے کی اجازت دیدی گئی۔ اپنے روزنامچہ میں بلنٹ ایک جگہ کہتا ہے کہ اُس سے مفتی عبدہ نے ایک دفعہ یہ کہا تھا کہ ہندوستان سے شیخ پہلے امریکہ گئے اور وہاں سے یورپ آئے لیکن کسی ذریعہ سے بھی امریکہ کے سفر کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ممکن ہے کہ چند روز کے لئے وہ امریکہ چلے گئے ہوں مگر اُن کی زندگی کا یہ زمانہ بالکل خاموش ہے اور یقیناً امریکہ میں اُن کا قیام بہت مختصر رہا ہوگا اس لئے کہ وسط ۱۸۸۳ء میں وہ پیرس آ چکے تھے۔

ہندوستان سے شیخ برطانوی حکومت کے متعلق جو تاثرات لیکر نکلے تھے اُن کا اندازہ بلنٹ کے روزنامچہ سے ہوتا ہے۔ پیرس میں شیخ سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے بلنٹ لکھتا ہے کہ :۔

"شیخ نے کہا کہ ہندوستان میں عام طور پر یہ خیال ہے کہ ہندوستان پر روسی حملہ کریں گے اور انگریزوں کو نکال دیں گے۔ اور یہ واقعہ جلد پیش آنے والا ہے . . . . . اب روسی مرو تک آ گئے ہیں۔ وہاں بہت جلد روسی حکومت قایم ہو جائیگی اور پھر ہندوستان پر روس کا حملہ ہوگا۔ . . . .

. . . انہوں نے کہا کہ برطانوی گورنمنٹ ہندوستان کے مسلمانوں کی بہت نگرانی کرتی ہے۔ ہندوستان جاسوسوں سے بھرا ہوا ہے جن میں

بہت زیادہ ہندو ہیں۔ یہ حالت ہندوستانی "انقلاب" کے زمانہ سے ہے شیخ ۱۸۵۷ء کے غدر کو "انقلاب" کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ شیخ نے کہا کہ جہاں کوئی شیخ زیادہ مشہور ہوتا ہے تو انگریز مجسٹریٹ اس کو بلاتا ہے۔ تین کتابیں اس کے سامنے رکھی جاتی ہیں۔ قرآن۔ صحیح بخاری اور حدیث۔ پھر اُس سے سوال کیا جاتا ہے کہ تم ان کتابوں پر اعتقاد رکھتے ہو؟ ظاہر ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اپنے محترم پیشوا کی کتابوں پر میں اعتقاد رکھتا ہوں۔ پھر مجسٹریٹ جہاد کے متعلق مختلف احکام کو نکال کر دکھاتا ہے اور دریافت کرتا ہے کہ ان احکام کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے؟ اور غریب کو حکم دیا جاتا ہے کہ بیس دن یا مہینہ بھر کے اندر ان احکام کے متعلق اپنے خیالات تحریری پیش کرو۔ اب اگر اس کے خیالات مجسٹریٹ کے نزدیک قابل اطمینان نہیں تو بہت ممکن ہے کہ وہ بیچارہ کالے پانی بھیج دیا جائے جہاں بہت سے ... میرا خیال ہے کہ شیخ نے تعداد پانسو بتائی تھی ـــــ نظربند ہیں۔ شیخ نے کہا کہ ہندوستان میں گورنمنٹ ہمیشہ مختلف اقوام کے درمیان نااتفاقی پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے خصوصاً ہندو اور مسلمانوں کے درمیان اور بظاہر اُس کو کامیابی بھی ہوتی ہے"۔

ہندوستان کی یہ تصویر شیخ اپنے دماغ میں لیکر یہاں سے گئے تھے لیکن ہندوستان سے زیادہ اب ایک وسیع تر میدان اُن کے پیش نظر تھا اور پیرس آنے کے بعد پھر کبھی اُن کی زندگی میں اُن کو ہندوستان کے حالات کی طرف

توجہ کرنے کا موقعہ نہ ملا۔ اون کی تمامتر توجہ ایران۔ مصر اور ٹرکی پر مائل رہی۔
پیرس کی آزاد آب وہوا میں جہاں شیخ مشرقی درباروں کی سازشوں اور برطانوی حکومت کے دست دراز سے محفوظ تھے اُنھوں نے اسلامی ممالک میں ایک عام سیاسی بیداری پیدا کرنے کا پروپیگنڈا زیادہ شدت اور انہماک کے ساتھ شروع کر دیا۔ مشرقی ممالک کے اکثر مہاجرین جو اپنی حکومتوں کے مظالم سے بچکر بھاگ نکلے تھے پیرس ہی میں پناہ پاتے تھے۔ چنانچہ شیخ کے پیرس پہنچنے کے بعد ہی شیخ عبدہٗ بھی پیرس آگئے اور استاد اور شاگرد کے اس اجتماع نے شیخ کی دعوت کو زیادہ قوی اور ان کے جہاد کو زیادہ باثر بنا دیا شیخ کا اول ہی سے یہ خیال تھا کہ مشرقی اقوام کی سوتی ہوئی قوتوں کو جگانے کے لئے اخبارات کی بہت ضرورت ہے۔ چنانچہ وہ قومی اور آزاد اخبار نویسی اور اخبارات کے ذریعہ سے مطالبہ حقوق کا بیج مصر کی سرزمین پر ڈال گئے گو وہ ابھی بارآور نہ ہوا تھا۔ اب انھوں نے پیرس میں العروۃ الوثقیٰ کے نام سے ایک پرچہ جاری کیا۔ عبدہ کے مکان سے یہ پرچہ شائع ہوتا تھا اور اسی مکان میں غالباً خود شیخ اور مفتی عبدہٗ بھی مقیم تھے۔ درحقیقت العروۃ الوثقیٰ کے نام سے شیخ نے پیرس میں ایک انجمن قایم کر لی تھی اور اس انجمن کی آواز یہ پرچہ تھا۔ براؤن کا خیال ہے کہ مئی سنہ ۱۸۸۴ء میں عروۃ الوثقیٰ کا پہلا نمبر شائع ہوا تھا لیکن میرے پاس اُس کا پہلا نمبر موجود ہے اور اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳ مارچ سنہ ۱۸۸۴ء سے اُس کی

اشاعت شروع ہوئی تھی۔ اس پرچہ کے کل ۱۸ نمبر شائع ہوئے اور اس طرح غالباً
اکتوبر ۸۴ء میں وہ بند ہو گیا۔ ان ۱۸ پرچوں کے مضامین مصر میں شائع
ہو چکے ہیں لیکن اصلی پرچے بہت کم لوگوں کے پاس پائے جاتے ہیں اہل ذوق
شیخ کے ان پارہ ہائے جگر کو ڈھونڈتے ہیں اور نہیں پاتے۔ پروفیسر براون کے
پاس بھی چار پانچ اصلی پرچے موجود تھے مگر خوش قسمتی سے میں نے العروۃ الوثقیٰ
کے ۱۰ پرچے حاصل کر لئے ہیں اور میں ان کو شیخ کے متعلق اپنی تلاش و تحقیق کا
ایک قیمتی سرمایہ اور عزیز یادگار سمجھتا ہوں پہلے پرچہ کا افتتاحیہ گو جمال الدین یا مفتی
عبدہٗ کا لکھا ہوا نہیں معلوم ہوتا تاہم اس کے چند الفاظ اس لئے نقل کرتا ہوں
کہ وہ شیخ کے خیالات و عزائم کا پرتو ہیں۔

"جب کسی قوم میں ضعف و غفلت کا غلبہ ہوتا ہے تو کوئی اجنبی
قوت اس پر مسلط ہو جاتی ہے۔ تا آنکہ اس کا یہ پنجہ استبداد
اس قوم میں ایک روح تازہ پیدا کر دیتا ہے اور وہ محسوس
کرتی ہے کہ اس کی گئی ہوئی قوت پھر حاصل ہو سکتی ہے اگر اتحاد
و اتفاق سے کام لیا جائے
نفوس انسانی کی خاصیت کچھ ایسی ہے کہ پہلے تو وہ ظلم و قہرمانیت
کو برداشت کرتی ہے لیکن جب یہ چیز حد سے تجاوز کر جاتی ہے
تو اُن کا بزدل بھی شیر دل ہو جاتا ہے، لومڑی بھی پلنگ بن جاتی ہے

اور باالآخر کوئی نہ کوئی راہ خلاصی کی نکال ہی لیتی ہے . . . .
. . . مشرقی اقوام پر اسوقت ظلم وستم کی انتہا ہو چکی ہے، ہر مغلوب
قوم پیکر غربت بنی ہوئی ہے، بالخصوص مسلمانوں کی حالت تو ناگفتہ بہ
ہے اُن کے سلاطین باعظمت تخت حکومت سے محروم کر دئے
گئے ہیں، ان کے صاحب حقوق لوگ اپنے حقوق سے محروم ہیں
اُن کے باعزت لوگ ذلیل کرائے گئے ہیں، اُن کے غنی فقیر
کر دئے گئے ہیں۔ تندرست وتوانا لوگ لنگڑے لولے اور اپاہج کر دئے
گئے ہیں، اُن کے شیر نیستان چوپاؤں سے بدتر ہو گئے ہیں خصوصًا
اس پانچ سال کے عرصہ میں بسلسلہ حوادث بالا مصر میں جو تخم پاشی
ہوئی ہے وہ تو خوب ہی ہے۔ لیکن انشاء اللہ وہ جنھوں نے یہ
تخم پاشی کی ہے پھل ایسا پائیں گے جو اُن کے طرز عمل کی
مکافات ہوگا۔ یعنی اُس نخل بے ثمر سے اگر وہ پھل پائیں گے
تو اندرائن ؎"

پھر یورپ کی طرف اشارہ کر کے لکھتا ہے کہ :۔

" یہ حرص وہوس کے ٹھیکیدار، یہ قومیں جہاں جاتی ہیں دوست
بنکر جاتی ہیں رفاقت ومحبت کے لہجہ میں باتیں کرتی ہیں۔ رفتہ
رفتہ اُن میں حاکمانہ اسپرٹ کا اظہار رہتا ہے۔ کہیں وہ تخت حکومت

کی حفاظت کے لئے جاتی ہیں کہیں کسی ملک کو اغیار کی دستبرد
سے بچانے، کہیں کسی ملکی حکومت کو مستحکم و قوی بنانے، کہیں
بغاوت کے جراثیم پر حملہ کرنے، غرض جب کہیں جاتی ہیں تو
طرز اُن کا یہی ہوتا ہے مگر بھر چھا جاتی ہیں۔"

کس قدر گرم، کس قدر تلخ، کس قدر قوی وہ جذبات ہوں گے جن کے
ماتحت العروۃ الوثقیٰ کا پہلا افتتاحیہ لکھا گیا ہوگا۔ العروۃ الوثقیٰ کے مضامین
نگاروں میں ہر ملک کے قوم پرستوں کا نام آنے لگا تھا۔ منجملہ اُن کے مصری
قوم پرست سعد زاغلول بھی تھا، جو شیخ کے معتقدین میں اور شیخ کے
سیاسی متبعین میں سے تھا۔ کچھ تعجب نہیں کہ العروۃ الوثقیٰ کے مضامین نے
نہ صرف لندن اور یورپین ممالک کے دفاتر خارجہ میں بلکہ مصر میں بھی ایک ہنگامہ
برپا کر دیا۔ مشرق کی کوئی آواز اس وقت تک مغرب کی دراز دستیوں کے خلاف
اس قوت کے ساتھ بلند نہ ہوئی تھی۔ العروۃ الوثقیٰ کی آواز نے لندن اور قاہرہ
میں نیندیں حرام کر دیں اور اُس کے پرچے جن کے سرورق پر ایک طرف
شیخ کا نام اور دوسری طرف مفتی عبدہٗ کا نام شائع ہوتا تھا۔ لندن۔ پیرس۔ برلن
اور مصر کے اخبارات میں نقل کئے جانے لگے۔ شیخ جنھوں نے خود بھی فرانسیسی
زبان سیکھ لی تھی ان مضامین کے تراجم فرانسیسی اخبارات کے ذریعہ سے
دنیا کی دوسری زبانوں میں شائع کراتے تھے۔ فرانس کی علمی دنیا میں شیخ کی

شخصیت کو اُن کے علمی مقالات نے بہت بلند کردیا تھا خصوصاً عالم فرانسوی
رینان کے ایک مقالہ کے جواب میں شیخ نے جو مضامین ژورنال وزوبا اور
ریویو سائنٹیفک میں لکھے انھوں نے شیخ کے تبحر کا ایک روشن نقش قائم کردیا
رینان کا موضوع یہ تھا کہ اسلام سائنس کے عمل کا مخالف ہے، اور شیخ کے
جوابات کے بعد رینان نے اپنے جواب الجواب کا عنوان بھی "اسلام اور علم"
رکھا تھا۔ یہ مضامین ۱۸۸۳ء میں کلمان لیوی نے تصانیف رینان کے نام سے
شائع کردئے تھے مگر ایک ہی سال بعد انکا عربی ترجمہ حسن آفندی عاصم نے مصر
میں شائع کیا۔ مصر سے جب شیخ نکالے گئے تھے تو خدیو توفیق نے اُن کی ایک ہزار
کتابیں ضبط کرلی تھیں، لیکن پیرس میں پھر انھوں نے اپنا ایک ذاتی کتب خانہ
جمع کرلیا تھا، معلوم نہیں کہ بعد کو وہ کہاں گیا۔

العروۃ الوثقیٰ کو وہ مالی مشکلات کی وجہ سے جاری نہ رکھ سکے۔ غالباً انکی
غیور طبیعت نے غیروں سے مالی امداد کا حاصل کرنا گوارا نہ کیا۔ یہ اُن کے کیرکٹر
کا ایک امتیازی نشان تھا جب وہ مصر سے نکالے گئے اور یورپ جانے کے
لئے سویز آئے تو اُن کے پاس زاد راہ بھی نہ تھا۔ ایرانی قنصل نے چاہا کہ کچھ
امداد کرے لیکن اُن کا جواب اُن کے کیرکٹر کی صحیح تصویر تھا۔ انھوں نے کہا،
"آپ اپنا روپیہ اپنے ہی پاس رکھیں مجھ سے زیادہ آپ کو اس کی ضرورت ہے
شیر جہاں جائے گا اپنی غذا ڈھونڈھ لیگا" اسی طرح ایک دفعہ پیرس سے لندن

آئے تو وہاں بھی تنگدستی نے پریشان کیا، لیکن اس کو برداشت کرتے رہے اور کبھی گوارا نہ کیا کہ کسی سے امداد چاہیں۔ اُسی زمانہ میں اُن کے کسی دوست نے اُن کے حالات کے متعلق بلنٹ کو ایک خط لکھا تھا جو مجھے ۱۹۲۶ء میں بلنٹ کے کاغذات میں مل گیا تھا۔ اس کی چند سطریں بہت دلچسپ ہیں۔

"میں یہ سطریں بصیغہ راز لکھ رہا ہوں۔ یہ مطلب آپ ہی تک محدود رہے۔ جمال الدین مالی حیثیت سے بہت تنگ ہیں۔ انکو اب لندن کی اقامت چھوڑ کر نواح لندن میں جانا پڑا ہے۔ کسی نے ان کو کچھ روپیہ دینا چاہا تھا مگر اُنھوں نے لینے سے انکار کر دیا اب جمال الدین کو ریلوے کے تیسرے درجہ میں سفر کرنا پڑیگا۔ ایسے عظیم الشان شخص کے لئے یہ تکلیف کسقدر افسوسناک ہے۔ اس لئے آپ سے التجا کرتا ہوں کہ جمال الدین کے لئے ایک ہزار فرانک وہبی بے کے پتہ پر نمبر ۳۱ بڈفورڈ پلیس۔ رسل اسکوئر میں بھیجدیجیے۔ اُن کو معلوم نہیں کہ میں آپ کو روپیہ کے لئے لکھ رہا ہوں۔ اُن کو بہت غصہ آئے گا اگر یہ معلوم ہو جائے۔"

شیخ کی تمام زندگی اسی طرح گذری مگر وہ کبھی اپنی زبان پر مالی مشکلات کی شکایت نہیں لائے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہی مالی مشکلات تھیں جنھوں نے العروۃ الوثقیٰ کی زندگی کو اسقدر مختصر کر دیا۔ تاہم آجتک یہ حال ہے کہ شیخ کا جو کوئی نام لیتا ہے

وہ العروۃ الوثقیٰ سے بھی واقف ہے۔ شاید ہی مشرق میں کسی اخبار کو اتنی مختصر زندگی میں اسقدر مقبولیت حاصل ہوئی ہو۔

پیرس کے قیام میں شیخ کا تعلق برطانوی سیاسیات کے مدوجزر سے بہت کافی رہا اور اُس کا وسیلہ زیادہ تر بلنٹ تھے، اُن ہی کی تحریک پر کچھ روز کے لئے شیخ لندن گئے تھے بلنٹ یہ چاہتا تھا کہ برطانوی وزارت کے بعض ارکین سے شیخ کی معاملات مصر کے متعلق گفتگو کریں۔ چنانچہ ۱۸۸۵ء میں وہ بادل ناخواستہ لندن گئے اور کچھ روز ساوتھ واٹر میں بلنٹ کے پاس ہی مقیم رہے۔ لیکن یہ زمانہ گلیڈسٹون کی پالیسی کے نصف النہار کا زمانہ تھا۔ اور برطانوی سیاست کے ماہرین مشرقی ممالک کی آزادیوں کو ختم کرکے مشرق پر مغربی پالیسی کا پورا تسلط قائم کرنا چاہتے تھے۔ علاوہ بریں شیخ کے مضامین کا لندن میں بہت چرچا ہو چکا تھا اور برطانوی مدبرین شیخ کے ارادوں کو بہت بُری نظر سے دیکھ رہے تھے، تاہم بلنٹ کی کوششوں سے شیخ نے لارڈ چرچل اور سر ڈرامنڈ ولف سے ملاقاتیں کیں۔ ولف مصر میں برطانیہ کا نمایندہ ہوکر جارہا تھا، مگر وہ پہلے اسلامبول جانے والا تھا اور برطانوی حکومت کی یہ خواہش تھی کہ شیخ اُس کے ساتھ اسلامبول جائیں اور ترکی و برطانیہ کی بعض الجھنوں کو سلجھانے میں مدد دیں۔ اسی کے ساتھ اُن سے وعدہ کیا گیا کہ تخلیہ مصر کا سوال بھی طے کردیا جائے گا۔

لیکن اِن امور کے طے ہوجانے کے بعد، یکایک ولف روانہ ہوگیا اور

شیخ کا ساتھ لے جانا منسوخ کر دیا گیا۔ برطانوی سیاست کی اس اضطراری کروٹ نے شیخ کو بہت متاثر کیا اور اسی کے بعد اُنھوں نے ارادہ کر لیا کہ اب وہ برطانوی مدبرین کی میٹھی باتوں سے دھوکا نہ کھائیں گے اور اس کے بعد وہ ہمیشہ ہمیشہ اُن سے متنفر رہے۔ چنانچہ اپنی روانگی سے پہلے جو خط انھوں نے بلنٹ کو لکھا اوس میں اُن کی مایوسی اور غم و غصہ کی ایک جھلک نظر آتی ہے انھوں نے ۱۷ جولائی ۱۸۸۵ء کو یہ خط تحریر کیا۔

"آپ کے کارہائے نمایاں اور مساعی جمیلہ کا ہر شخص کی زبان پر چرچا ہے۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور تمام باتوں سے محفوظ رکھے۔

میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ موجودہ وزارت کی حکمت عملی بھی مصر اور سوڈان کے بارے میں کچھ گذشتہ وزارت ہی کی سی ہے میٹھے اور خوشگوار وعدوں سے بھوک کب جاتی ہے۔؟

جہاں تک میں سمجھتا ہوں مصر کا مسئلہ افغانستان کے معاملہ پر منحصر ہے اور افغانستان کا معاملہ تمامتر میرے ہاتھ میں ہے اس لئے میں نے تو یہ طے کر لیا ہے کہ آیندہ ہفتہ افغانستان روانہ ہو جاؤں اور میرے جانے سے انشاءاللہ آپ کا مقصد بھی پورا ہو گا۔

عنقریب میں آپ کو اپنی کارگزاریوں سے مطلع کروں گا لیکن شرط
یہ ہے کہ اُنھیں اس وقت تک اپنے ہی تک رکھیئے گا جب تک
کہ ہم کسی مفید نتیجہ پر نہ پہنچ جائیں۔"
اس خط سے شیخ کے ارادوں کا کافی اندازہ ہوتا ہے۔ گو کہ وہ اسوقت
اپنے حسب منشا براہ راست افغانستان نہ جا سکے لیکن اُن کا بجائے افغانستان
کے روس کی طرف جانا بھی یہ بتا رہا ہے کہ وہ مصر کی مشکلات کو حل کرنے کے
لئے افغانستان اور روس کا متحدہ دباؤ انگلستان پر ہندوستان میں ڈلوانا
چاہتے تھے اور اس طرح ایک نیا نقشہ جنگ تیار کر کے مصری قوم پرستوں کی
امداد کرنا چاہتے تھے اور اس منصوبہ میں تلبنٹ بھی اُن کا ہم خیال تھا۔ یہ معلوم
کہ مسلمانان بلخ و بخارا سے اُن کے بہت کافی تعلقات تھے۔ بہر حال وہ روس
ضرور گئے۔ لیکن یہاں اُن کی زندگی کی داستان ذرا مشتبہ ہو جاتی ہے اور
اس امر کا فیصلہ، متضاد بیانات کی وجہ سے مشکل ہو جاتا ہے کہ پیرس سے وہ
پہلے روس گئے یا اول ایران گئے، پھر وہاں سے روس گئے اور پھر ایران
واپس آئے یا اول روس گئے، پھر ایران آئے، پھر دوبارہ روس گئے اور
پھر ایران واپس آئے۔ میں اس معمہ سے حاضرین کو تھکانا نہیں چاہتا اور کسی
دوسرے موقع پر اس اُلجھیڑے کو سلجھانے کی کوشش کروں گا۔ لیکن بہر حال
سلسلہ بیان قائم رکھتا ہوں میرے اُن بلند مقام افغان راوی کا جن کا ذکر

پہلے کیا جا چکا ہے یہ بیان ہے کہ "موسی جار اللہ از شریف سید جمال الدین ۔ بہ پترو گراد ہم بمن گفتند کہ بنا برا زروے حکومت روسیہ رفتہ بود و شاید قریب دو سال در آنجا بود است ۔ و در مسئلہ مناسبات مسلمانان و حکومت روسیہ مبادلۂ افکار کردہ است"

روس میں اُنھوں نے اخبار مسکوی کے مشہور اڈیٹر کاتکوف سے بہت زیادہ رسم وراہ پیدا کی اور اُس کے ذریعہ سے اپنی آواز کے لئے ایک راستہ پیدا کیا لیکن کاتکوف کا اُسی زمانہ میں انتقال ہو گیا اور شیخ کے منصوبوں کو یقیناً اوس کے انتقال سے صدمہ پہنچا ۔ تاہم وہ روس میں مقیم اور مسلمانان روس کی فلاح میں ساعی رہے ۔ چنانچہ اُنھوں نے روسی مسلمانوں کی ایک بڑی خدمت یہ انجام دی کہ کہ زار کو آمادہ کر کے کلام مجید کی اشاعت کی اجازت دلوادی جس کی اشاعت اُسوقت تک روس میں ممنوع تھی ۔ اسی دو برس میں شیخ کی ملاقات شاہ ایران سے ہوئی اور پھر وہ بوشہر ہوتے ہوئے ایران تشریف لے گئے اور وہاں سے پھر ایک دفعہ شاہ کا کوئی پیام لیکر روس گئے ۔ رسالہ کاوہ کے ایک مضمون سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شیخ تین ماہ بوشہر میں مقیم رہے ۔ وہاں مرزا نصر اللہ خاں اصفہانی اور فرصت شیرازی سے بہت ارتباط رکھتے تھے برادُن لکھتا ہے کہ روس میں اونھوں نے شاہ ایران سے ملاقات پسند نہ کی لیکن آخر کار میونخ میں ملاقات ہوئی اور وہیں سے شاہ اُن کو بہ اصرار طہران لے گیا ۔ بوشہر کا قیام اس سلسلۂ بیان میں اچھی طرح چسپاں نہیں ہوتا ۔ لیکن بہرحال اس داستان کا وہ کوئی

اہم حصہ نہیں ہے۔ حاصل کلام یہی ہے کہ شیخ کو شاہ نے عہدہ وزارت پیش کیا اور براؤن اُن کے دوست شیخ عبدالقادر المولی کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ اُنھوں نے شاہ کی دعوت پر بہت اظہار تعجب کیا اور شیخ سے کہا کہ "کیونکر ممکن ہے کہ شاہ آپ کو ایسے عہدہ پر فائز کرے جبکہ یہ معلوم ہے کہ آپ سنی مذہب کی تقویت کیلئے کیا کیا کوشش کر چکے ہیں" تو شیخ نے صرف اتنا ہی کہا کہ "یہ بھی شاہ کی ایک حماقت معلوم ہوتی ہے" قصہ مختصر، شیخ شیراز و اصفہان ہوتے ہوئے طہران پہنچے اور حاجی محمد حسین امین الغرب کے گھر مہمان ہوئے۔

ایران میں شیخ کی عملی زندگی کا اہم ترین زمانہ ۸۹ سے شروع ہوتا ہے وہ بادشاہ کے مہمان ہو کر گئے تھے لیکن اُن کے افکار و عزائم شاہ کے اثرات سے بہت دور تھے۔ وہی ایک جذبہ جو اُن کو مصر اور روس لے گیا تھا، یا نجد و خلیج فارس کی طرف لے گیا وہی جذبہ اُن کو ایران میں کھینچ کر لایا تھا۔ اور کچھ ہی عرصہ بعد اُس جذبہ کے مظاہرے شروع ہو گئے۔

شیخ کا بہت بڑا کارنامہ جو مصر و ایران میں اُن کی زندگی کا نشان ہے یہ تھا کہ جو جماعت، یعنی جماعت علماء، شہنشاہیت کی پرستار اور مددگار تھی اُسی سے اُنھوں نے شہنشاہیت اور مطلقیت کے فنا کرنے کا کام لیا۔ تاریخ اسلامی کے اس دور میں قدامت پسند علماء کا گروہ حقوق انسانیت کا حامی نہ تھا بلکہ مخالف تھا۔ تاہم شیخ ہی کا وہ جادو تھا جس نے اس استبداد پسند جماعت کے

قلوب کو بدل دیا۔ اور حقوق ملت کے چوروں ہی کو "آدمیت" اور انسانیت کا محافظ و پاسباں بنا دیا۔ شیخ کی سیاسی زندگی کا یہ سب سے بڑا معجزہ تھا۔!

ناصرالدین شاہ کی زندگی کے آخری چند سال ایران کے قومی مصائب اور ایرانی شہنشاہیت کے عذاب کے بدترین چند سال تھے۔ شاہ کو یورپ کی دلچسپیوں اور عیاشیوں نے اپنا گرویدہ کر لیا تھا اور اس کی دولت یورپ کے بازاروں اور قہوہ خانوں میں پانی کی طرح بہائی جاتی تھی۔ ناصرالدین شاہ کا تیسرا اور آخری سفر یورپ وہ تھا جب وہ یورپ سے اپنی شہنشاہیت کے سخت ترین دشمن کو مہمان بنا کر ساتھ لایا تھا، جس طرح فرعون کے محل میں موسیٰ لائے گئے تھے۔ ناصرالدین نہ صرف اپنا خزانہ خالی کر چکا تھا بلکہ اس کی رعایا کی جیبیں بھی خالی ہو چکی تھیں۔ اب مصر کی طرح یہاں بھی یورپ کے ساہوکار قبضہ جما رہے تھے۔ مشرق کے تاجداروں کے تاجوں کو گرو رکھنے کے لئے یورپ کا بنیا ہمیشہ تیار رہتا ہے۔ اس لئے کہ وہ خوب جانتا ہے کہ تاج کے ساتھ تخت بھی اس کے گھر آئے گا۔ ناصرالدین کی تنگدستی نے اس کو قرضے لینے اور یورپین سرمایہ داروں کو اپنے ملک میں ہر قسم کی مراعات دینے پر مجبور کر دیا تھا چنانچہ ۱۸۸۹ء میں برطانوی سرمایہ داروں کو طہران میں شاہی بنک قائم کرنے کا ٹھیکہ دیدیا گیا اور اسی کے چند روز بعد تماکو کے اجارہ کا قصہ پیش آیا جس نے بالآخر انقلاب کے دروازے کھولدئے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۸۸۹ء کو شاہ سفر یورپ سے

واپس آئے، شیخ اُن کے ہمراہ تھے۔ چند ہی روز بعد اہواز سے طہران تک سڑک بنانے کا ٹھیکہ ایک برطانوی کمپنی کو دیدیا گیا۔ ۸ مارچ ۹۰ء کو ایک انگریزہی کو تمام ایران کے تماکو کی کاشت کا اجارہ دار بنا دیا گیا تقریباً ۱۰ کروڑ کے سرمایہ سے اس کمپنی نے اپنا کام شروع کیا۔ اس اجارہ کے خلاف سب سے پہلے شاہزادہ ملکم خاں نے، جو لندن میں ایرانی سفیر تھے احتجاج کیا اور اسی بنا پر شاہ نے اون کو سفارت کے عہدہ سے برطرف کر دیا۔ ملکم خان کی زبردست شخصیت نے اس موقع پر اپنے تمام ذاتی اثرات کو حکومت کے خلاف نکتہ چینی میں صرف کر دیا۔ وہ اپنے عہدہ سے برطرف ہو کر لندن ہی میں مقیم رہے اُنھوں نے اخبار "قانون" جاری کیا۔ اس اخبار نے ایرانی شہنشاہیت کو ناقابل تلافی نقصان پہونچایا۔ شیخ کے مضامین بھی "قانون" میں شائع ہونے لگے اور تھوڑے ہی عرصہ میں یہ راز ظاہر ہو گیا کہ شیخ، ملکم خاں کی اس تحریک سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح شیخ کی زبردست آواز خط کے لفافہ میں طہران سے لندن جاتی تھی اور لندن سے "قانون" کے پرچے میں طہران واپس آ کر ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل جاتی تھی شاہ اُن کے اصلی رنگ سے واقف ہو چکا تھا اور وہ بھی کھل کر میدان میں آ گئے تھے۔ جانفروشوں کی ایک جماعت اُن کے حلقہ میں داخل ہو چکی تھی، شیخ علی قزوینی جو بعد کو قاضی عدلیہ ہوئے۔ مرزا آقا خان جنھوں نے بعد میں قسطنطنیہ سے اخبار اختر جاری کیا، اور پھر تبریز میں

خفیہ طور پر قتل کر دیے گئے، شیخ احمد کرمانی، مرزا رضا کرمانی جس نے ناصرالدین شاہ کو قتل کیا اور طہران میں پھانسی پائی۔ مرزا محمد علی خاں طہرانی، اور ایسے ہی بہت سے نام شیخ کے عقیدت مندوں کی فہرست میں تھے۔ ان میں سے بہت سے وہ نام تھے جو آج بھی تاریخ انقلاب ایران کے صفحات پر آب زر سے لکھے ہوئے ہیں لیکن جیسا کہ اس جنگ آزادی میں ہمیشہ پیش آتا ہے۔ حکومت کے بلند مقام ارکین شیخ کے بڑھتے ہوئے اثرات کو گوارا نہ کر سکے اور وزیر اعظم امین السلطنۃ نے بہت جلد شاہ کو شیخ کی مخالفت پر آمادہ کر دیا۔ اس عرصہ میں بہت سی خفیہ انجمنیں ملک میں قایم ہو چکی تھیں اور شاہ اپنے کو سخت خطرہ میں پاتا تھا شیخ بھی اب امین السلطنۃ اور شاہ کے منصوبوں سے بے خبر نہ تھے، چنانچہ اُنھوں نے شاہ سے اجازت چاہی کہ طہران کے باہر شاہ عبدالعظیم کی خانقاہ میں اقامت اختیار کریں اور شاہ نے بھی اس خیال سے کہ یہ فتنہ خاص دارالسلطنت سے دُور ہو جائے اُن کو وہاں جانے کی اجازت دیدی لیکن جب وہ شاہ عبدالعظیم میں جا کر بیٹھے تو وہاں بھی مشاہیر، علما، اور عوام ہزاروں کی تعداد میں حاضر ہونے لگے اور شیخ کی تبلیغ و تلقین کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ۸ مہینے اس طرح گذر گئے اور اس ۸ مہینہ میں داعی حریت کی آواز ایران کے ہر گوشہ میں سرایت کر گئی اور وہ ملت ایران کے ایک مصلح اعظم سمجھے جانے لگے۔ اسی زمانہ میں شیخ نے ایک مکتوب شاہ کو بھیجا اور دریافت کیا کہ وہ کیوں اُن سے بدگمان

ہیں۔ لیکن اس مکتوب کے جواب میں شاہ نے شاہ عبدالعظیم میں شیخ کو اُن کے بستر علالت پر گرفتار کرالیا اور وہیں سے ۵۰ سواروں کی نگرانی میں عثمانی سلطنت کی سرحد پر بھیجدیا۔ شیخ کے خارج البلد کیے جانے کی خبر نے تمام ملک میں آگ لگادی اور شاہ کو اپنی موت سامنے نظر آنے لگی۔ بلاشبہہ شیخ کا ایران سے جانا شاہ کی موت کا آنا تھا۔

شیخ نے ایران سے نکلتے ہی مجتہدین عراق و کربلا اور علمائے ایران کی دبی ہوئی آگ کو بھڑکا دیا۔ اور جو زمین وہ تیار کرچکے تھے اُس پر اپنا کام شروع کردیا جو خطوط شیخ نے علما و مجتہدین کو لکھے، اُن میں سے ایک کا کچھ حصہ ان اوراق میں اس لئے پیش کرتا ہوں کہ شیخ کے اُن جذبات سے آپ روشناس ہوجائیں جو ایران کے متعلق اُن کے قلب کو بیچین کررہے تھے۔ سمارا کے مجتہد اعظم حاجی مرزا حسن شیرازی کو لکھتے ہیں :-

"میں حق کہتا ہوں، یہ خط شریعت اسلامی کی خاطر لکھتا ہوں۔ جہاں کہیں وہ شریعت جاری ہو اور قایم ہو۔ یہ ایک اپیل ہے جو میں تمام حق پسند روحوں سے کرتا ہوں۔ جو شریعت پر ایمان رکھتی ہیں اور اُسکے نافذ کرنے کی کوشش کرتی ہیں یعنی میں اپیل کرتا ہوں علماء اسلام سے اور یہ اپیل میں تمام علماء سے کرتا ہوں حالانکہ میرے مخاطب اُن میں سے ایک ہی ہیں . . . .

خدا نے آپ کو اس اعلیٰ نیابت پر فایز کیا ہے۔ تاکہ آپ حقیت عظیمہ کے نمایندہ ہوں اور خدا نے ملت بیضا سے آپ کو منتخب کیا ہے کہ آپ انسانوں کی باگ ہاتھ میں لیکر شریعت اسلامی کی حفاظت و نگرانی کریں۔ اہل ایران اب ظلم و ستم کے اندر اپنے بیت الدین کو دیکھکر بیتاب ہوگئے ہیں۔ جو اغیار و کفار کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا ہے اور جس پر اُن اغیار و کفار کا قبضہ قایم ہوگیا ہے۔ مگر کسی لیڈر کے نہ ہونے کی وجہ سے اہل ایران پریشان ہیں منقسم ہیں اور معطل ہیں۔ وہ حیران ہوتے ہیں اُن کا ایمان متزلزل ہوتا ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ اُن مجتہدین کی طرف سے کوئی آواز بلند نہیں ہوتی جن کو وہ اپنا رہنما اور اسلامی مفاد کے معاملات میں اپنا لیڈر سمجھتے ہیں۔ اور سب سمجھنے کا حق رکھتے ہیں۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں۔ اور یہ سچ بھی ہے کہ تیرا ایک لفظ ان کو متحد کر دیگا اور تیری ہی حجت فیصلہ کن ہوگی، تیرا ہی حکم بااثر ہوگا اور کسی کی مجال نہ ہوگی کہ تیرے حکم پر حرف زنی کر سکے اور اگر تو چاہے گا تو متفرق عناصر کو اپنے ایک لفظ سے متحد کرا دے گا۔ اور اس طرح خدا کے دشمنوں کے دل میں خوف خدا پیدا کر دے گا۔ اور کفار کے ظلم سے اہل ایران کو بچا لیگا۔ تیرا ہی ایک لفظ اس مصیبت و ابتلا کا خاتمہ کر دے گا'

جس میں اہل ایران گھرے ہوئے ہیں اور اُن کو زندگی کی سختیوں
سے نجات دیکر راحت و آرام عطا کرے گا۔ پس دین کی حفاظت
ہو جائے گی اور اُس دین کے حلقہ بگوش اُس کو سنبھال لیں گے اور
اسلام کا مرتبہ بلند ہو جائے گا . . . . اے امام اعظم! بے شبہہ
بادشاہ کی قوت ارادی کمزور ہے، اُس کی سیرت خراب ہے۔ اور
اُس کا دل گندہ ہے۔ وہ ملک پر حکومت کرنے اور اہل ملک کے
معاملات کو سدھارنے کے قابل نہیں ہے اور اُس نے حکومت
کی باگیں ایک بے دین ظالم اور غاصب کے سپرد کر دی ہیں۔
جو رسول پر علانیہ استہزا کرتا ہے۔ اور شریعت حقہ کی پروا نہیں کرتا
جو امرائے شریعت کو خیال میں نہیں لاتا اور علما پر لعنت بھیجتا ہے
اہل زہد و تقوی کو ذلیل کرتا ہے اور سادات کی تحقیر کرتا ہے۔ علاوہ
ازیں کفار کے ملک سے واپس آنے کے بعد وہ بالکل قابو سے
باہر ہو گیا۔ علانیہ شراب پیتا ہے اور کفار کی صحبتوں میں وقت
گذارتا ہے یہ ہے اُس کا چلن۔ مگر اس کے علاوہ اس نے ایرانی
زمین کا بڑا حصہ مع اُس کے منافع کے کفار کے ہاتھ فروخت
کر ڈالا (اشارہ ہے معدنیات کی طرف) یہی نہیں بلکہ سڑکیں،
کاروان سرائے، باغات، کھیت سب ہی کچھ اُس نے وقف

کر ڈالے . . . . تماکو کی تمام زراعت، مع زمین و عمارات کے، انگور کی فصل مع کارخانوں اور سامان تجارت کے. صابن موم بتیاں، اور شکر کے تمام کارخانے غرض سب کچھ مع متعلقات اُس نے کفار کی نذر کر دیا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ بنک۔ آپ کیونکر سمجھیں گے کہ بنک کیا ہے اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ دشمنان اسلام کو گویا ساری سلطنت دے ڈالی۔ . . . .

اب جو کچھ رہ گیا ہے اُس نے روس کے سامنے پیش کر دیا تاکہ روس خاموش رہے یعنی مندب رشت، دریائے طبرستان، شہر انزل و خراسان مع تمام مکانات و سرائیں اور متعلقہ اراضیات مزروعہ کے، مگر روس نے ناک بھوں چڑھائی اس لئے کہ وہ تو کُل خراسان، آذربائجان اور مازندران کی فکر میں ہے . . . .

. . . . یہ ہے پہلا نتیجہ اس پاگل کے طرز عمل کا . . . .

اور تو، اے حجۃ الاسلام، کیا تو اس قوم کی مدد کے لئے نہ اٹھے گا اور اُن کو متحد نہ کر دے گا اور شریعت مطہرہ کی قوت سے اس ملک کو اُس گناہگار کے ہاتھ سے نجات نہ دلوائے گا؟ بلاشبہہ بہت جلد یہ اسلامی مملکت اغیار کے زیر اقتدار ہوگی جو وہاں جس طرح چاہینگے حکومت کریں گے۔ اگر تو نے یہ موقع جانے دیا، اور

اے امام! اگر یہ واقعہ تیری زندگی میں پیش آگیا تو لاریب تو اپنا نام تاریخ کے صفحات پر روشن نہ چھوڑ جائے گا!"

اس کے بعد شیخ نے اُن مظالم کا ذکر کیا ہے جو اُن کے رفیقوں پر اور خود اُن پر کیے گئے۔ اُنھوں نے اپنے ایران سے نکالے جانے کی داستان ذرا تفصیل کے ساتھ لکھی ہے کہتے ہیں کہ :۔

"اب میری داستان اور جو کچھ اُس ناشکرگذار ظالم نے میرے ساتھ کیا وہ بھی سُن لیجئے۔ اُس مردود نے طہران کی برف سے ڈھکی ہوئی سڑکوں پر ذلت کے ساتھ میرے گھسیٹے جانے کا حکم دیا جبکہ میں خانقاہ عبدالعظیم میں پناہ گزیں تھا اور بہت بیمار تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اُسکے ذلیل خادموں نے مجھے باوجود میری علالت کے ایک باربردار ٹٹو پر سوار کرایا اور زنجیروں سے باندھ دیا اور یہ سب اُس وقت کیا گیا، جاڑوں کا موسم تھا، برف کے طوفان آرہے تھے، اور بہت سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ اس طرح مجھے سواروں کی نگرانی میں خانقین پہنچایا گیا جہاں پہلے ہی گورنر والی سے طے کرلیا گیا تھا کہ مجھے بصرہ بھیجدیا جائے۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اگر مجھے آزاد چھوڑ دیا گیا تو میں سیدھا تیرے پاس آؤنگا، اے امام! اور تجھے اس کے مظالم سناؤں گا اور مملکت ایران کے حالات بتاؤں گا اور تجھ سے

لے حجۃ الاسلام مدد چاہوں گا۔"

شیخ کا یہ زبردست اپیل ایک بجلی کی طرح ایرانی مجتہدین کی جماعت میں سرایت کر گیا اور ایران میں تماکو کے اجارہ کے خلاف وہ شدید اور خوفناک آگ بھڑکی جس نے ناصرالدین شاہ کا جامہ ہستی جلا ڈالا۔ اپنے جلاوطن ہونے سے پہلے شیخ نے ایران کی سرزمین پر شہنشاہیت کے خلاف اس قدر بارود پھیلا دی تھی کہ اُنکی جلاوطنی کے چند ہی روز بعد "انقلاب" کی آواز ایران کے کوچہ و بازار میں گونجنے لگی۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ بظاہر اسباب شیخ کی تعلیمات خود مختار بادشاہوں کی جان کی دشمن معلوم ہوتی تھیں اور یہ شبہ کچھ بیجا نہیں کہ شیخ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے شدید ترین آلات حرب استعمال کرنے کو بھی جائز سمجھتے تھے۔ اُن کے اس سیاسی مذہب سے کتنا ہی اختلاف کیا جائے لیکن اُن کی بے مثال قربانیوں اور اُن کے اعلیٰ منتہائے خیال کے متعلق دنیا کا کوئی وطن پرست ایک حرف نہیں کہہ سکتا۔ جیسا کہ مصر کے حالات میں ظاہر کیا جا چکا ہے، اُن کی سیاست کا وہی رنگ ایران میں بھی تھا۔ علمائے کے طبقہ میں آگ لگا کر اُنھوں نے گویا ناصرالدین شاہ کی شہنشاہیت کو آگ لگا دی اور گو وہ خود اُس ملک سے نکال دئے گئے لیکن اپنے بعد وہاں بہت سے سرفروش چھوڑ گئے جن میں سے ایک نے بالآخر ناصرالدین سے اُس کے مظالم کا خوفناک بدلا لے لیا۔ مرزا رضا کرمانی نے اپنی گرفتاری کے بعد اور پھانسی پانے سے

پہلے جو بیان عدالت میں دیا اُس کی ایک معتبر نقل ہم کو براؤن کے ذریعہ سے ملی ہے مرزا رضا خاں کے الفاظ اُس کے جذبات اور اُن جذبات سے شیخ کے تعلق کی ایک دلچسپ تصویر ہیں :-

"سید جمال الدین، اولاد رسولؐ نے کیا قصور کیا تھا کہ اُس کو شاہ عبدالعظیم کی محترم خانقاہ سے اس طرح ذلت کے ساتھ گھسیٹ کر نکالا گیا کہ اُن کے جسم کے کپڑے تک پارہ پارہ ہو گئے۔ یہ تمام ذلت اُن کو برداشت کرنی پڑی مگر اُنھوں نے کیا کہا تھا سوائے حق کے؟ .... جو لوگ میرے عقائد و خیالات سے اس ملک میں متفق ہیں اُن کی تعداد بہت ہے اور وہ ہر طبقہ کے لوگ ہیں علماء کی جماعت میں امراء میں اہل حرفہ اور سوداگروں میں بہت سے میرے ہم خیال ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب سید جمال الدین اس شہر میں آئے تھے تو طہران اور شاہ عبدالعظیم میں ہزارہا آدمی اُن کے خطبات اور مواعظ سنتے تھے۔ اور چونکہ وہ جو کچھ کہتے تھے وہ خدا کے لئے تھا اور مفاد عامہ کی خاطر، ہر شخص کو اُن کے خطبات سے فائدہ ہوتا تھا اور اُن کے مواعظ کا ہر شخص گرویدہ تھا اس طرح اُنھوں نے بلند خیالات کا بیج لوگوں کے دلوں کی زمین میں بویا اور انسان جاگے اور اپنے ہوش میں آ گئے۔ اب تو ہر شخص وہی

خیالات رکھتا ہے جو میرے ہیں لیکن میں قسم کھاتا ہوں اُس خدا
کی جس نے سید جمال الدین اور تمام انسانوں کو پیدا کیا کہ سوائے
میرے اور سید جمال الدین کے شاہ کے قتل کے ارادے
کی خبر کسی کو نہ تھی۔ سید تو اب قسطنطنیہ میں ہیں جو تمھارا
جی چاہے کرو۔"

ناصر الدین شاہ یکم مئی ۱۸۹۶ء کو قتل کیا گیا، یعنی شیخ کے ایران سے نکالے
جانے کے ۴ سال بعد۔ لیکن ایران کا یہ سارا دور وہ تھا جب شیخ کا
ڈالا ہوا تخم بار آور ہو رہا تھا اور شیخ قسطنطنیہ میں بیٹھے ہوئے اپنی کوششوں
کے نتائج دیکھ رہے تھے۔ مرزا رضا خاں کا بیان یہ شبہ پیدا کرتا ہے کہ شاہ
کے قتل میں شیخ کا اشارہ موجود تھا۔

ایران سے نکلکر شیخ بصرہ پہنچے اور حاجی علی اکبر شیرازی سے جو خود ایک
ایرانی مہاجر تھے مشورہ کر کے لندن چلے گئے جہاں ملکم خاں نے ایرانی شہنشاہیت
کے خلاف بہت زیادہ زمین تیار کر لی تھی۔ غالباً لندن جانے کا اصلی باعث
وہاں ملکم خاں اور بلنٹ کی موجودگی تھی ۱۸۹۱ء میں وہ لندن پہنچ گئے۔ اور
براؤن کہتا ہے کہ اُس کی ملاقات پہلی مرتبہ شیخ سے ہالینڈ پارک میں ملکم خاں ہی
کے مکان پر ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں اُنھوں نے چند جلسوں میں "ایران کے
خوفناک عہد" کے عنوان سے زبردست تقریریں کیں اور اُسی زمانہ میں

ضیاء الخافقین کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جسکے بہت سے اقتباسات بعد کو المنار میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ وقت تھا کہ تماکو کے خلاف علماء کا فتوی ایران میں شائع ہو چکا تھا اور اُس فتوے کا یہ اثر ہوا تھا کہ خود شاہ کے محل میں شاہی قلیان کے لئے تماکو میسر نہ آتا تھا۔ شاہ کو پہلی دفعہ پبلک کی آواز سے مجبور ہو کر اس ٹھیکے کو منسوخ کرنا پڑا اور بلاشبہ یہ شیخ کی پہلی فتح تھی، علاوہ بریں یہ فتح علماء کے لیئے بھی تھی۔ ضیاء الخافقین کے صفحات پر شیخ اپنے شدید ترین جذبات کا اظہار کر رہے تھے اور اس میں شبہ نہیں کہ طہران میں شیخ کی آواز کی گرج شاہ کو لرزا رہی تھی۔ یکم مارچ ۱۸۹۱ء کی اشاعت سے شیخ کی چند سطریں نمونتاً پیش کیجاتی ہیں۔

"جب یہ بادشاہ، یہ زہریلا سانپ، یہ گناہ گار، سلطنت ایران پر مسلط ہوا۔ اُس نے آہستہ آہستہ علماء کے حقوق میں دست اندازی کرنی شروع کی، اُن کے رتبہ کو گرانے لگا اور اُن کے اثرات کو کم کرنے لگا تاکہ خود مطلق العنان ہو کر حکومت کرے۔ اور اپنے ظلم و تعدی کے دائرہ کو وسیع کر سکے .... مگر حق باطل کے مقابلہ میں بلند ہوا اور اُس نے شاہ کے ظلم کو کچل ڈالا جس طرح کہ ہر ظالم کا ظلم کچلا جاتا ہے۔ اے اسلام کے رہنماؤ میں سچ کہتا ہوں کہ تم نے اپنے عزم و استقلال سے اسلام کے وقار کو بڑھا دیا ہے۔ غیر ملکیوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ اصل طاقت تمھاری ہے

جس کو وہ نہ دبا سکتے ہیں نہ نظر انداز کر سکتے ہیں۔ مگر خطرہ سخت ہے
اور حالت نازک ہے اس لئے کہ شیطانوں نے اتحاد کر لیا ہے
اور اب وہ اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے اس پر تلے ہوئے
ہیں کہ اُس گنہگار (شاہ) کو بہکا کر علماء کو خارج البلد کر دیا جائے۔"

یہ مضامین وہ عموماً "سید" یا حسینی سید کے نام سے لکھا کرتے تھے
اور جیسا کہ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ الفاظ کی سختی، درشتی اور تلخی میں اُن کا قلم
کچھ کفایت شعار نہ تھا! اُن کے عزم اور حوصلہ کی اب یہ حالت تھی کہ ایک موقع
پر اُنھوں نے صاف کہدیا تھا کہ " ان بادشاہوں کا تخت سے اُتارنا اتنا ہی
آسان ہے جتنا کہ پاؤں سے جوتے کا اُتارنا"

تقریباً ڈیڑھ سال تک اس طرح لندن میں مشغول رہ کر وہ اپنی زندگی کے
آخری دور میں داخل ہوئے یعنی ۱۸۹۲ء میں سلطان عبدالحمید خاں کی دعوت پر
لندن سے قسطنطنیہ چلے گئے۔ وہاں سلطان نے شیخ کے لئے ۵۰ پونڈ ماہوار
وظیفہ بھی مقرر کر دیا اور ان کی مدارات میں بہت زیادہ توجہ کا اظہار کیا لیکن عبدالحمید
کا شیخ کو قسطنطنیہ بلانا ایک خاص پالیسی کے ماتحت تھا۔ عبدالحمید خاں اپنے
تخت و تاج کی حفاظت کے لئے اتحاد اسلامی کا ایک قلعہ تعمیر کرنا چاہتا تھا اور
خلافت اسلامی کا اشتہار دیکر وہ دنیا کی عقیدت مندی کو اپنی طرف متوجہ کرنا
چاہتا تھا وہ سمجھتا تھا کہ یورپین دول کی جانب سے جو خطرات اُسکے گرد و پیش

بڑھتے جاتے ہیں ان کا علاج صرف یہی ہے کہ اسلامی ممالک کی ہمدردیاں اُس کے ساتھ ہوں۔ چنانچہ ان ہی منصوبوں کے تحت میں اوس نے شیخ کے اثرات سے کام لیکر مکہ میں ایک انجمن کی بنیاد رکھوادی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ شیخ کو اپنے زیر اثر رکھ کر اُن کے اثرات کو جو عالم اسلامی میں مسلمہ تھے اپنے حق میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ شروع شروع میں جب شیخ کے ساتھ اُس کی توقعات بہت زیادہ وابستہ تھیں، عبدالحمید خاں ہر موقع پر اونکے بہت بڑے حامی و مددگار کے بھیس میں دنیا کے سامنے آتا تھا۔ جب ناصرالدین شاہ نے چاہا کہ شیخ کی آواز اُس کے خلاف بند ہو تو اپنے سفیر کے ذریعہ سے بار بار دربار خلافت میں اس امر کی تحریک کی کہ شیخ کو اُن کی جد وجہد سے روکا جائے۔ چنانچہ عبدالحمید خاں نے ایک دن شیخ سے کہا کہ شاہ ایران کی مخالفت اب ترک کر دو" اور شاہ ایران آپ سے بہت خوف زدہ ہیں"" اور شیخ نے بھی سلطان کی خاطر سے کہدیا کہ "اچھا خلیفہ وقت کے حکم کی تعمیل کرنے کے لئے میں شاہ ایران کو معاف کرتا ہوں" لیکن تیر شیخ کے ہاتھ سے پہلے ہی نکل چکا تھا اور وہ شرارہ ایران میں گر چکا تھا جس نے ناصرالدین کی خرمن ہستی کو جلا دیا۔ تاہم اس واقعہ سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ شیخ اور خلیفہ کے تعلقات اُسوقت کیسے تھے۔ اسکے بعد بھی جب ناصرالدین شاہ قتل کر دیا گیا تو حکومت ایران نے شیخ اور بعض دیگر اشخاص کو ٹرکی سے گرفتار کر کے لیجانا چاہا، لیکن سلطان عبدالحمید خان نے اوروں کو تو

گرفتار کرادیا لیکن شیخ کی گرفتاری کی اجازت نہ دی۔ شیخ نے اس موقعہ پر خلیفہ کی حکومت سے پناہ نہیں مانگی نہ اُنھوں نے بھاگنے کی کوشش کی بلکہ غالباً وہ اس لئے مطمئن بیٹھے رہے کہ وہ سلطان عبدالحمید کے منصوبوں سے بیگانہ نہ تھے اور جانتے تھے کہ سلطان کو ابھی اُن کی خدمات کی ضرورت ہے۔ مکہ کی انجمن ام القریٰ کو سلطان اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہے تھے اور حجاز و عراق میں شیخ کے اثرات سے کام لیا جا رہا تھا۔ لیکن بہت جلد سلطان عبدالحمید خاں کو شیخ کی رفاقت سے مایوس ہو جانا تھا۔ درحقیقت شیخ کا سیاسی مذہب عبدالحمید کی پالیسی کا بالکل مخالف تھا۔ عبدالحمید خاں خلافت کے نام سے، عالم اسلامی کی ہمدردیاں اپنے تخت و تاج کے ساتھ وابستہ کر کے ٹرکی کو یورپین دول کے خطرات سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے اور شیخ اول ہی سے ہر ایک تاج و تخت کے دشمن تھے۔ انکا اتحاد اسلام بالکل دوسرے معنیٰ رکھتا تھا۔ اور وہ ہر جگہ شہنشاہیت اور مطلقیت کے خلاف جذبات ملی کو بیدار کرنا چاہتے تھے اور ممالک اسلامی کی بیداری کو اپنے عالمگیر اتحاد اسلام کا سنگ بنیاد بنانا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک تمام اسلامی ممالک شخصی حکومتوں کے جبر و ظلم سے آزاد نہ ہوں گے۔ آپس میں ایکدوسرے سے کوئی عملی ہمدردی نہیں کر سکتے، اس لئے اُن کو کوئی دلچسپی عبدالحمید خاں کی تحریک کے ساتھ نہیں ہو سکتی تھی۔ یورپ نے جس چیز کا نام پین اسلامزم رکھا وہ عبدالحمید خاں کا تیار کیا ہوا ایک بھوت تھا جس نے اُس وقت کی سیاسیات کے لحاظ سے بعض

یورپین دول کے دفاتر خارجہ کی نیندیں حرام کردیں۔ مگر یورپ میں جمال الدین کے
پین اسلامزم پر کوئی عمیق نظر نہیں ڈالی گئی۔ بلکہ ان کو صرف اسلامی ممالک کا
ایک فتنہ پرداز، یورپین اثرات کا دشمن، اور بادشاہوں کی بادشاہت کا مخالف
سمجھا گیا اس کے آگے بہت کم لوگوں کی نظر گئی اور مجھے شبہ ہے کہ خود براؤن اور
بلنٹ بھی شیخ کی پرواز خیال کے ساتھ کس حد تک چل سکے۔ بہرحال یورپ کی
اصطلاح میں خلافت اور پین اسلامزم کا جو مفہوم سمجھا گیا تھا۔ شیخ اُس سے بہت
بلند، بہت دور، اور بہت الگ جا رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عبدالحمید خاں بہت
جلد اُن سے مایوس اور بدگمان ہو گئے اور شیخ کی زندگی کا آخری زمانہ قسطنطنیہ
میں ایک گمنام قیدی کی طرح گذرا۔

"ترک مجاہد شیخ جمال الدین افغانی" کے عنوان سے اخبار وطن (قسطنطنیہ)
میں چند سال ہوئے شیخ کی سیرت پر ایک مضمون شائع ہوا تھا گو کہ شیخ کے
سوانح نگاروں نے اُن کی نظربندی کی تفصیلات بیان نہیں کیں لیکن اس مضمون
سے واضح ہوتا ہے کہ شیخ کو عبدالحمید خاں نے اس بنا پر قید کر دیا تھا کہ خلیفہ کے
صیغۂ جاسوسی نے اُس کو یہ اطلاع دی تھی کہ شیخ سلطان کے خلاف سازشیں
کر رہے ہیں، اور یہ روایت بہت زیادہ قرین قیاس ہے، اس لیے کہ عبدالحمید خاں
کی سیاست کا اُس زمانے میں یہی رنگ تھا کہ وہ اپنے سایہ سے بھی ڈرتے تھے
اور شیخ کے متعلق شبہات کا نہ پیدا ہونا پیدا ہونے سے زیادہ تعجب انگیز ہوتا

بہرحال اُس زندگی کی مختصر رُوداد ختم ہوتی ہے۔ میں نے شیخ کے علم و فضل، ذاتی مشاغل، فلسفیانہ، خیالات، عقاید مذہبی اور اُن کی شہرت کے بہت سے ضروری پہلوؤں کے لئے ان مختصر صفحات میں گنجائش نہ پائی۔ نہ میں اپنے سننے والوں کو بہت زیادہ تھکانا چاہتا ہوں۔ وہ چیزیں سب اپنے موقع پر بیان ہونگی، شاید کہ شیخ کی زندگی کا کوئی نکتہ کسی حق شناس تک پہنچ جائے! میرے پاس اُن کے مضامین اور اُن کے خطوط، کا ایک اچھا مجموعہ ہے جو بجائے خود ایک دلچسپ علمی دعوت کا سامان فراہم کریگا، لیکن اُس کے لئے کوئی دوسری فرصت درکار ہے۔

ایران میں جو جسمانی سختیاں شیخ نے برداشت کی تھیں اُن کا بہت زیادہ اثر شیخ کی صحت پر ہوچکا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ ایران سے آنے کے بعد پھر وہ اپنی کھوئی ہوئی صحت کبھی حاصل نہ کرسکے۔ قسطنطنیہ میں وہ اکثر بیمار رہتے تھے اور بالآخر دوران نظربندی میں اُن کو سرطان کا لاعلاج عارضہ لاحق ہوا۔ اس مرض کے سلسلہ میں تین دفعہ اُن کے چہرے اور گردن پر عمل جراحی کیا گیا، لیکن اپنے رب کے پیام پر لبیک کہنے کا وقت آچکا تھا۔

۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو اُس مجاہد کی زندگی کا کام ختم ہوگیا اور قسطنطنیہ کی سرزمین پر اُس نے اپنی آخری منزل کو پالیا۔ اب یہ بحث دوراز کار ہے کہ جمال الدین کو عبدالحمید خاں نے زہر دلوایا تھا یا نہیں۔ جتنا کام قسام ازل نے اُن کے

سپرد کیا تھا وہ اس کو انجام دے گئے، دنیا والے اب جسقدر جی چاہے اوس پر تنقید و تبصرہ کے دریا بہا دیں، لیکن بیداری مشرق کے اس بہت بڑے پیامی کا نام اس وقت تک دنیا میں روشن رہے گا جب تک کہ دنیا آباد ہے۔ اہل نظر کے لئے یہ ایک سبق آموز داستان ہے۔

نشان طاش کے قریب ایک قبرستان میں شیخ کی قبر عرصہ تک بے نشان رہی۔ ان کے جنازہ کے ساتھ بھی ۲۰ آدمیوں سے زیادہ نہ تھے، لیکن دنیا ان کو بھولی نہ تھی۔ ہندوستان کا تو ذکر ہی کیا کہ ہم خود اپنے ملک کے مشاہیر کو مرنے کے بعد ایک ہفتہ کے اندر بھول جاتے ہیں، لیکن تعجب تو یہ ہے کہ شیخ کی زندگی کا زیادہ سرمایہ مغرب میں محفوظ رہا اور عبدالحمید کے بعد ترکوں نے ان کی آخری آرامگاہ کو پھر ڈھونڈھ نکالا۔ ایک امریکن کروڑپتی نے ان کی قبر کے لئے سنگ مرمر کا ایک خوبصورت پتھر تیار کرا کر بھیجا تو ایک نوجوان ترک نے ایک غیر ملکی کی اس فیاضی سے متاثر ہو کر قسطنطنیہ کے ایک اخبار میں لکھا کہ :-

"میں نے ایک اخبار میں پڑھا ہے کہ ایک امریکن مسٹر کراین نے اس بڑے مسلمان عالم کے لیے ایک نہایت شاندار سنگ مرمر کا مزار بنایا ہے یہ امریکن کروڑپتی ہے مگر اس کی تازہ ترین قدرشناسی نے نہ معلوم کیوں میرے دل میں مسرت اور افسوس سے ملا ہوا ایک حس پیدا کیا۔ جمال الدین افغانی کے لیے ایک محتشم و شاندار مزار کا بنایا جانا حقیقتاً ایک ایسا اچھا کام ہے جس سے روح تسلی پاتی ہے

جمال الدین اپنی تمام زندگی میں دنیاوی جاہ و جلال سے بے پروا
رہا اور اپنی متواضع زندگی کے شایاں اسی کو سمجھا کہ اپنی قبر کے لئے
دو گز زمین سے زیادہ نہ لے۔ اس میں فراعنہ مصر کا غرور نہ تھا کہ
اپنی لاش کی حفاظت کے لئے اہرام بنوائے۔ اس لحاظ سے ایک
محتشم مزار کا بنایا جانا اُس کے اعزاز میں کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ مگر
انصاف شرط ہے۔ کیا اُس کی یادگار کے لئے اس قدر اہتمام
بھی اُس کے مداحین پر لازم نہ تھا؟ . . . .
میں اس سے تو خوش ہوں کہ جمال الدین کا مزار اُس کی ایک مادی
یادگار ہوگا مگر میرے قلب کے ایک گہرے اور مغرور گوشے میں
ایک خفیف ٹھیس لگتی ہے اور میرا دل سوال کرتا ہے کہ جمال الدین کے
مزار کو ایک ترک ایک افغان یا ایک ایرانی نے (جسے جمال الدین
کے ایرانی ہونے پر بہت اصرار رہتا ہے) کیوں تعمیر نہ کرایا۔''
یہ تو ایک ترک کا جذبہ تھا، میں اپنے ہم وطنوں سے کیا کہوں، اُن میں سے
کتنے ہیں جو قسطنطنیہ جاتے ہیں اور وہاں کبھی جمال الدین کی قبر پر دو پھول چڑھانے
کا ارادہ کرتے ہوں؟
اپنے آخری لمحوں میں جب زبان بند تھی اور چند آنسو بہانے کیلئے دوست
بستر مرگ کے قریب بیٹھے تھے، اُس نے ہاتھ کے اشارے سے حلقہ بنا کر کہا تھا

کہ "میں مرجاؤں گا مگر میری آنکھیں اسی طرح کھلی رہیں گی جس طرح تم دیکھتے ہو"۔ جو الفاظ شیخ نے اپنے مرنے سے چند روز پہلے اپنے محبس سے ایک دوست کو لکھے اُن ہی کو میں ان سطور کا خاتمہ بناتا ہوں کہ وہ ان کے آخری جذبات کا بہت دردناک مرقع ہے اُنھوں نے لکھا تھا کہ :-

"من بسرِ موقع ایں نامہ را بدوستِ عزیز خود می نویسم۔ کہ در محبسِ محبوس واز ملاقاتِ دوستاں خود محرومم، نہ انتظارِ نجات دارم، نہ امید حیات۔ نہ از گرفتاری متالم نہ از کشتہ شدن متوحش، خوشم بر ایں حبس وخوشم بر ایں کشتہ شدن جسم برائے آزادی نوع، کشتہ می شوم برائے آزادی قوم"

مجاہد حق کی یہ آواز حق تھی، اور یہ جذبۂ عالی تھا، جو آندھی بن کر اٹھا بجلی بن کر چمکا، اور اس طرح گرجا کہ مشرق کی سوتی ہوئی دنیا کروٹیں لینے لگی۔ آج وہ نہیں ہے مگر اُس کا پیام باقی ہے۔

مطبوعات اردو اکادمي

——:o:——

نفسیات مذهب۔ پروفیسر سید وهاج الدین صاحب ایم۔اے کامقاله
جو ۷ جنوری سنه ۳۲ع کو جلسه اردو
اکادمي مین پڑها گیا۔ قیمت ۸ آنه

آزادی۔ جان اسٹورٹ مل کی کتاب Liberty کاترجمه
از سعید انصاری صاحب بی اے (جامعه)
مقدمه از پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے
(آکسن) قیمت ایك رپیه ۸ آنه

نفسیات شباب۔ مصنفه پروفیسر اشپرانگر مترجمه ڈاکٹر سید
عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی(برلن)
قیمت ۳ روپیه

سیرة نبوی اور مستشرقین- انسائیکلوپیڈ یا بر ٹانیکا کے مضمون
'محمڈنزم' از ولهاؤزن کاترجمه مع مقدمه و حواشی
از ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب بی۔اے آنرز (جامعه)
پی۔ایچ ڈی (برلن) قیمت ایك روپیه ٤ آنه

تاریخ هند قدیم۔ از۔ ك۔م پانیکر صاحب ایم اے (آکسن)
قیمت ۸ آنه